گھروندا
علیم الحق حقی

گھروندا

زمین پر نام میرا روز وہ لکھے محبت سے
ہوا مارے رقابت کے سدا اس کو مٹا جائے
بنائے وہ میری خاطر گھروندا روز ساحل پر
کوئی موج سمندر روز ہی اس گھر کو ڈھا جائے

ماجد نے جھپٹ کر سڑک کراس کی۔ اس دوران سگنل کی روشنی تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ ایک منی بس کی لپیٹ میں آتے آتے بچا' لیکن اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ منی بس والے نے گاڑی روک لی ہے اور بڑی روانی سے اسے گالیاں دے رہا ہے۔ راہگیر بھی رک کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے' مگر وہ ان سب سے بے نیاز تھا۔ اس نے گھڑی میں دیکھا۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے گویا وہ لیٹ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے ۲۱ نمبر کے بس اسٹاپ کی طرف بڑھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ چلی نہ گئی ہو۔

بس اسٹاپ کی طرف مڑتے ہی اسے ۲۱ نمبر کی دو بسیں نظر آئیں۔ ایک بس اسٹاپ پر کھڑی تھی' جس کی بیشتر نشستیں ابھی خالی تھیں۔ دوسری اسٹارٹ ہو چکی تھی اور بس اسٹاپ چھوڑ رہی تھی۔ اس نے جاتی ہوئی بس کو دیکھا اور اس کا ذہن امید وبیم کی کیفیت میں معلق ہو گیا۔ بس اسٹاپ پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بس کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے دروازے سے اس نے بے حد سرسری انداز میں لیڈیز کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ وہاں دو بوڑھی خواتین بیٹھی تھیں لیکن وہ موجود نہیں تھی۔اس کی پابندی وقت کے پیشِ نظر یہ بات یقینی تھی کہ وہ جا چکی ہے مگر اس کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آج وہ بھی لیٹ ہو گئی ہو۔ محبت میں یہ ایک بات عجیب ہوتی ہے۔ ذہن اور دل مل کر امید کی رائی کو بھی پہاڑ بنا دیتے ہیں۔

اس نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ پھر اسے ایک خیال نے چونکا دیا۔ اگر وہ آئی اور بس میں بیٹھی تو خود اس کا بس میں اچانک بیٹھنا کس قدر معیوب ہو گا۔ بس میں بیٹھے ہوئے لوگ' نکڑ پر پان کی دکان والا اور وہاں کھڑے ہوئے لوگ اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھیں گے' سوچیں گے کہ وہ اتنی دیر کھڑا رہا اور لڑکی

کے آتے ہی بس میں بیٹھ گیا۔ کیوں؟ وہ بھانپ لیں گے، سمجھ جائیں گے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ مضطرب ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور نکڑ والے ریستوران کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑا ہو کر بس اسٹاپ پر نظر رکھ سکتا ہے اور اس کے آتے ہی جھپٹ کر بس میں سوار ہو سکتا ہے۔ تب شاید کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہو سکے گا.........شاید۔

طبعاً وہ بہت شرمیلا تھا۔ اس کے قریب ہی کہیں کوئی لڑکی موجود ہوتی تو اسے محسوس ہوتا کہ ہر شخص اسے شک آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں اس کی ایک ایک حرکت اس کے اندرونی اضطراب کی غمازی کرتی۔ دراصل اسے خواتین کی قربت کبھی میسر ہی نہیں آئی تھی۔ پاس پڑوس کی خواتین اور لڑکیاں کبھی اس کے گھر آتیں تو وہ اِدھر اُدھر ٹہل جاتا۔ کبھی کسی نے کچھ پوچھا تو نگاہیں جھکا کر جواب دے دیا۔ محلے کی معمر خواتین کے نزدیک وہ شرافت کا نمونہ تھا۔ جب کہ محلے کی تمام لڑکیاں اسے نرا اُلو سمجھتی تھیں۔ اس بات کا احساس اسے خود بھی تھا اور اسی احساس نے اسے لڑکیوں کے معاملے میں اور زیادہ اُلو بنا کر رکھ دیا تھا۔

وہ بیکری والی گلی کی طرف دیکھتا اور سگریٹ کے کش لیتا رہا پھر پیچھے سے ایک اور بس آئی، اور پہلے والی بس چلی گئی۔ اس نے سگریٹ سے سگریٹ سلگایا اور اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ اس کے آنے کی امید اب بھی باقی تھی۔ تیسری بس کے جانے کے بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا نو بج چکے تھے۔ اس کی امید دم توڑنے لگی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اب اس کے آنے کا امکان نہیں رہا ہے، وہ یقیناً جا چکی ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی خوش امیدی درحقیقت بہت بڑی حماقت تھی۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔ پھر وہ بلا ارادہ ریستوران میں داخل ہوا اور ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ بیرے نے بغیر کچھ کہے سنے اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھ دی۔

اچانک اسے دفتر کا خیال آ گیا۔ عجیب بات تھی۔ وہ دفتر جانے کے ارادے سے گھر سے چلا تھا یا اس لڑکی کی ہم سفری کے لئے، جس کا نام بھی اسے اتفاقاً معلوم ہوا تھا، جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ گزشتہ تین ماہ سے دفتر جانا بھی اس کے لئے ایک خوشی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ہیڈ کلرک صاحب اور اس

کے ساتھی، دفتر میں سبھی حیران تھے کہ اب وہ چھٹی نہیں کرتا اور نہ ہی زیادہ لیٹ ہوتا ہے، بلکہ ایک معمول کے مطابق ایک مخصوص وقت پر دفتر پہنچ جاتا ہے۔ لیٹ تو وہ اب بھی ہوتا تھا لیکن سرکاری دفتروں میں اتنی معمولی تاخیر کو لیٹ ہونے میں شمار نہیں کیا جاتا۔ وہ سب حیران تھے لیکن انھیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ محبت کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ انقلاب تین ماہ پہلے ہی تو آیا تھا۔

اس نے سامنے رکھی ہوئی پیالی سے چائے کا گھونٹ لیا اور برا سا منہ بنا کر پیالی ایک طرف کھسکا دی۔ اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ ایرانی ہوٹلوں میں سادہ چائے بہت خراب ہوتی ہے۔ اسے اسپیشل چائے کا آرڈر دینا چاہیے تھا۔ چائے پر فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگایا۔ اس بدذائقہ چائے کی یہ افادیت اپنی جگہ تھی کہ وہ اس کے زور پر ریستوران میں کافی دیر تک بیٹھ سکتا تھا۔ اس وقت وہ خاصا مایوس تھا۔ تین مہینے کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کی ہم سفری سے محروم رہا تھا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ احمقانہ محبت کا وہ بیج اس کے دل میں جگہ بنا چکا ہے۔ اسے اس دن کے رائیگاں ہونے کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اجنبی لوگ اس طرح بغیر تعارف کے، بغیر کسی حرفِ مدعا کے، یوں جزوِ رگِ جاں بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے بغیر بھری پُری دنیا سُونی سُونی اور زندگی بے مقصد لگنے لگتی ہے۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ لڑکی کا نام ہیلن ہے۔ نام بھی اسے اتفاقاً ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی خاتون نے ایک بار اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچنے کو بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بس کے عقب نما آئینے میں ایک چہرے کا عکس تھا اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اُس کے پاس اس لڑکی کے یہی چند حوالے تھے۔ یہ عجیب جذبہ تھا۔ شاید اسی کو پہلی نظر کی محبت کہتے ہیں۔ تین ماہ پہلے تک وہ پہلی نظر کی محبت کا شدت سے مذاق اڑاتا رہا تھا، اسے حماقت قرار دیتا رہا تھا، اور اب وہ خود اسی حماقت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

یہ سوچ کر اس خود پر غصہ نہیں آیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اتفاقات انسان کی زندگی میں کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کا ہانکا ہو رہا ہے، اسے کسی مخصوص سمت میں دھکیلا جا رہا ہے۔ خود اسے بھی تو پتہ نہیں چلا تھا۔ جو کچھ بھی

ہوا تھا' اس کی بنیاد محض اتفاق ہی تو تھا۔

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا' بلکہ وہ اس دن کو کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس روز وہ دفتر جانے کے لئے بس اسٹاپ پر پہنچا تو اس کی طبیعت کچھ گری گری سی تھی.........

اسے ٹاور جانا ہوتا تھا اور بسیں بھری ہوئی آتی تھیں۔ اسے ہر روز کھڑے ہو کر جانا پڑتا تھا لیکن اس روز اس کا کھڑے ہو کر جانے کا موڈ نہیں تھا پھر اسے ۲۱ نمبر کی خالی بس آتی نظر آئی وہ بلا ارادہ اس میں بیٹھ گیا۔ بس بالکل خالی تھی۔ وہ لیڈیز کمپارٹمنٹ سے ملحق سیٹ پر جا بیٹھا۔

۲۱ نمبر بس صدر سے ٹاور جاتی تھی' لیکن اس کا روٹ مختلف تھا۔ وہ کینٹ اسٹیشن' سول لائنز' مولوی تمیزالدین روڈ اور نیٹی جیٹی ہوتی ہوئی ٹاور پہنچتی تھی۔ اسی لئے صدر سے ٹاور جانے والی عام بسوں کے مقابلے میں زیادہ وقت لیتی تھی' لیکن ماجد کو وقت کی پرواہ نہیں تھی۔ سرکاری ملازمت میں یہی تو ایک سہولت ہے کہ جب جی چاہا' دفتر پہنچے اور جب جی چاہا' گھر لوٹ آئے۔

اس نے سگریٹ سلگایا اور دھواں کھڑکی سے باہر چھوڑ دیا۔ اب بس میں لوگ بیٹھنے لگے تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم سگریٹ پیتا رہا۔ پھر اچانک خوشبو کے ایک جھونکے نے اس کے خیالات کا سلسلہ منتشر کر دیا۔ وہ بھینی بھینی مدھر خوشبو تھی......... ہلکی ہلکی......... ورنہ تیز خوشبو تو اس کے سر میں درد کر دیتی تھی۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اس کے آگے والی سیٹ پر کوئی لڑکی آ بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور کمر تک آ رہے تھے۔ ماجد کو خوامخواہ تجسس ہوا' اس کا جی چاہا کہ لڑکی کا چہرہ دیکھے لیکن اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اس نے سگریٹ بجھایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا لیکن اس کا دھیان بدستور لڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ یہ اس کے لئے نئی بات تھی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کسی لڑکی کو بار بار دیکھنا چاہا ہو۔ کوئی انجانی سی کشش تھی' جو اسے اس لڑکی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ بس اب بھر چکی تھی۔ اس کے برابر والی نشست پر بھی کوئی آ بیٹھا تھا' چنانچہ وہ خود پر جبر کر کے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ اس نے شدید خواہش کے باوجود لڑکی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ وہی پرانا خوف عود کر آیا تھا کہ اگر اس نے لڑکی پر توجہ دی تو بس میں موجود

ہر شخص کو اس بات کا احساس ہو جائے گا۔

بس اب چل دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں پھیلائے بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ اپنی عادت کے مطابق تصور میں کھو گیا۔ وہ بے حد تصوراتی آدمی تھا' خوابوں میں گم رہنے والا۔ شرمیلے لوگوں کے تصور ہمیشہ بے حد زرخیز ہوتے ہیں۔ سو کسی تصور میں گم ہونا اس کے لئے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ البتہ ایک غیر معمولی بات ہوئی تھی' جس کا اسے شروع میں احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ پہلے وہ تصور میں گم ہوتا تھا تو ہر غیر عملی آدمی کی طرح تصور میں اپنی محرومیوں کی تلافی کرتا تھا۔ اپنا بنگلہ اپنی کار' اپنا طمطراق دیکھتا تھا لیکن جاگتی آنکھوں دیکھا جانے والا اس دن کا خواب یکسر مختلف تھا۔ وہ رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ ایک حسین باغ میں نرم گھاس پر بیٹھا تھا۔ گرد و پیش میں رنگوں اور خوشبوؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جدھر نظر اٹھتی' رنگ ہی رنگ دکھائی دیتے......... ہوا کے خوشبوؤں سے بوجھل جھونکے اس کے جسم سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ اس کے ذہن کو معطر کئے دے رہے تھے' لیکن اس منظر کی جان ایک نرم و نازک وجود تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی' جو اس کے سامنے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر اس طرح جھکا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ بالکل نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ خود اس سے بار بار سر اٹھانے کی التجا کر رہا تھا تاکہ اس کا چہرہ دیکھ سکے لیکن لڑکی کسی مورت کی طرح ساکت وصامت بیٹھی تھی۔

پھر وہ بری طرح چونکا۔ کسی نے اس کے گود میں رکھے ہوئے ہاتھ کو بڑی نرمی اور ریشم جیسی ملائمت سے سہلایا تھا۔ وہ لمس ایسا تھا' جیسے کوئی ہوا کا جھونکا اسے چھو کر گزر گیا ہو۔ اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کو دیکھا۔ وہ بے حد کرخت آدمی تھا۔ اس کے لمس میں اتنی ملائمت کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا وہ وہم تھا؟ لیکن اسی وقت اسے اپنے ہاتھ پر وہ اڑتا ہوا لمس پھر محسوس ہوا۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ وہ آنچل تھا' نیلا آنچل' اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا آنچل۔ وہ بری طرح بوکھلا گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ مسحور بھی ہو گیا۔ شریر آنچل کے اس لمس میں نہ جانے کیا تھا کہ اسے اپنی رگوں میں سرشاری دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ اس سے پہلے کسی لمس نے اسے اس طرح بے خود نہیں کیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ آنچل اسی طرح لمس کی زبان میں اس کے ہاتھوں سے

ہمیشہ سرگوشیاں کرتا رہے لیکن دوسری طرف برسوں سے خوف کا عادی ذہن آڑے آ رہا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے......... اسے کچھ کہہ نہ دے۔ شوق بھی شدید تھا۔ ایسے میں مفاہمت کی ایک ہی صورت تھی اور اس نے اسی پر عمل کیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو بالکل ساکت کر لیا اور برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا جو بڑی لا تعلقی سے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔

ماجد اس شخص کو دیکھتا رہا لیکن وہ کن انکھیوں سے اپنے ہاتھوں اور اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی لڑکی کو بھی دیکھتا رہا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے آنچل کو کھینچا۔ ماجد پوری طرح اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ آنچل کا الوداعی لمس اسے خدا حافظ کہتا محسوس ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ اسی وقت اس کی نظریں ڈرائیور کے سامنے نصب آئینے پر پڑیں۔ یوں اس نے پہلی بار اس لڑکی کا چہرہ دیکھا......... چہرہ نہیں عکس۔

وہ بیضوی چہرہ تھا' اور اس پر بلا کی ملاحت تھی۔ سانولی سلونی رنگت' چھوٹے نقوش' بھرے بھرے ہونٹ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ وہ بے حد حسین اور بولتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ اس نے خود کو براہِ راست ان آنکھوں میں دیکھتے پایا۔

لڑکی نے بھی آنچل کھینچتے ہی آئینے کی طرف دیکھا تھا۔

ماجد دیکھتا رہا۔ اسے گرد و پیش کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اس وقت ساری کائنات میں اس چہرے کے عکس اور ان آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں خفگی اور جھنجلاہٹ کی کیفیت تھی' جیسے اسے اپنے آنچل کی شرارت اور گستاخی ہی پر نہیں بلکہ اس پر بھی غصہ تھا' جس کی طرف وہ آنچل لہرا کر لپکا تھا۔ وہ بہت غور سے آئینے میں اس کا عکس دیکھ رہی تھی۔ پھر ماجد نے ان آنکھوں کا موسم بدلتے دیکھا۔ خفگی اور جھنجلاہٹ معدوم ہوئی اور اس کی جگہ ایک پاکیزہ سی نرماہٹ نے لے لی۔ ماجد کو ایسا لگا جیسے لڑکی کے آنچل نے اس بار بے حد نرمی سے' ریشم جیسی ملائمت سے اور پاکیزہ لطافت سے خود اس لڑکی کے دل کو چھو لیا ہے۔ آنکھوں میں ہر کیفیت' ہر موسم دل ہی کا تو ہوتا ہے۔ وہ تو محض آئینہ ہوتی ہیں۔

ان آنکھوں کا موسم ایک بار پھر بدلا۔ پاکیزہ نرماہٹ کی جگہ حیرت میں لپٹی ہوئی حیا آمیز پسندیدگی جھلکنے لگی۔ یا یہ اس کا وہم تھا' خواہش تھی اس کی۔ ماجد فیصلہ نہ کر سکا۔ پھر

لڑکی نے دریچوں پر پلکوں کی چلمنیں گرا دیں لیکن اس نے سر نہیں جھکایا تھا۔ ماجد کو ایسا لگا' جیسے وہ سو گئی ہو۔ وہ بہرحال آئینے میں اس کے عکس کو تکتا رہا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ لڑکی کی پلکیں اٹھیں' ایک ثانیے کے لئے۔ شاید وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ اب بھی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں یا شاید وہ چوری چوری چپکے سے اسے دیکھنا چاہتی ہو گی لیکن اسے آئینے کی طرف متوجہ پا کر اس نے پہلے پلکیں جھکائیں' پھر سر جھکایا اور پھر مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اب آئینے میں اس کے چہرے کا ایک رخ دکھائی دے رہا تھا' وہ بھی نامکمل۔ اس کے باوجود ماجد آئینے سے اپنی نظر نہ ہٹا سکا۔

"ٹکٹ بابو جی۔" کنڈکٹر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور ٹاور کا ٹکٹ لے لیا۔ پھر وہ حسبِ سابق کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ لڑکی بھی باہر دیکھ رہی تھی۔ کنڈکٹر لڑکی کی طرف پہنچا۔ لڑکی نے کنڈکٹر کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کوئنس روڈ۔" اس کی آواز میں بلا کا لوچ تھا۔

سفر کے دوران وہ دونوں آئینے کے ذریعے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ماجد کے لئے یہ بات باعثِ طمانیت تھی کہ یہ ملن یک طرفہ نہیں تھا۔ لڑکی بھی بار بار اسے دیکھتی رہی لیکن اس کے انداز میں ایک حجاب تھا' دلکش سا شرمیلا پن تھا۔ ماجد کا اپنا حال بھی ایسا ہی تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بے خبری میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اس کوشش میں کئی بار ان کی نظریں ملیں اور ہر بار وہ دونوں ہی جھینپ گئے۔ وہ آئینہ ان کے لئے ایک ایسا راستہ بن گیا' جس پر وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے کی آس میں چلتے تھے اور ملنے پر نظریں چرا لیتے تھے۔

وہ مختصر سا سفر تھا یا کوئی خواب' جو اتنی جلدی ختم ہو گیا۔ لڑکی مولوی تمیزالدین روڈ پر ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اتر گئی۔ اس کے اترنے کے بعد ماجد کو خلا کا سا احساس ہوا۔ اس کا سینہ خالی خالی سا تھا' بس خالی خالی سی تھی اور بس ہی کیا' جیسے ساری کائنات بے روح ہو کر رہ گئی تھی۔ پانچ منٹ بعد اس کا اسٹاپ بھی آ گیا اور وہ بس سے اتر گیا۔

اس روز اپنے دفتر کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی لے مختلف تھی۔ اندر کا موسم جو بدلا ہوا تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا نرمی سے اسے چھوتا تو اسے اس آنچل کا لمس یاد

آ جاتا۔ اس روز دفتر میں بھی اس کا عجب حال رہا۔ بے خودی کی اس کیفیت میں اس نے کام بھی معمول سے زیادہ کیا۔ گھر پہنچ کر بھی وہ کھویا کھویا سا رہا اس رات اس کی آنکھوں میں موسمِ جوانی کا پہلا خواب اترا تھا۔

اگلے روز اس کے قدم خود بخود ۲۱ نمبر کے اسٹاپ کی طرف بڑھ گئے۔ وہ سوا آٹھ بجے وہاں پہنچا اور بس میں بیٹھ گیا......... اگلی سیٹ پر۔ پھر بس چلنے لگی۔ وہ اداس ہو گیا کہ شاید وہ ایک دن کی ہم سفری کسی سہانے خواب کی مانند تھی' آنکھ کھلی اور کھیل ختم۔ وہ بائیں سمت کی کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسی وقت بیکری والی گلی میں وہ آتی دکھائی دی لیکن وہ خاصی دور تھی۔ اس کے باوجود اس کا جی چاہا کہ اسے پکارے لیکن وہ اسے کس نام سے پکارتا......... کس رشتے کے حوالے سے پکارتا؟

بس گزر گئی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ پہلے ہی اسٹاپ پر اتر جائے اور ایمپریس مارکیٹ واپس جائے لیکن اس میں ایک خدشہ تو یہ تھا کہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بس چل دی تو کیا ہو گا۔ اس کے علاوہ وہ ازلی خوف بھی تھا کہ لوگ کیا کہیں گے' اسے کن نظروں سے دیکھیں گے۔ چنانچہ وہ بیٹھا پہلو بدلتا رہا۔

وہ سفر ہی نہیں بلکہ وہ دن بھی بے کیفی سے عبارت تھا۔ دفتر میں وہ اُکھڑا اُکھڑا رہا اور وقتاً فوقتاً چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتا رہا۔ شام کو گھر پر بھی اس کی یہی کیفیت رہی۔ البتہ رات کچھ بہتر ثابت ہوئی۔ بستر پر لیٹا ہوا آدمی حکمراں ہوتا ہے۔ سب کچھ اس کے اختیار ہوتا ہے۔ تصور اور خواب دونوں مملکت ہی تو ہوتے ہیں' جن میں آدمی مطلق العنان ہوتا ہے۔ اب پھر وہی بس تھی' وہ دونوں تھے' وہی آئینہ تھا اور وہی نظروں کی آنکھ مچولی۔ صرف ایک فرق تھا۔ بس بالکل خالی تھی' حتیٰ کہ اس میں ڈرائیور بھی نہیں تھا' پھر بھی وہ چل رہی تھی۔ ہر طرف کیف ہی کیف تھا۔

تیسری صبح وہ مناسب وقت پر گھر سے نکلا اور آٹھ بج کر ۲۵ منٹ پر بس اسٹاپ پر پہنچا جو بس کھڑی تھی' اس کی اگلی نشستیں بھر چکی تھیں۔ پیچھے کچھ سیٹیں خالی تھیں لیکن وہ ان پر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ نکڑ والی پان کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ خریدا اور پھر بس کی طرف آیا۔ اس دوران باقی سیٹیں بھی بھر چکی تھیں۔

وہ بس میں چڑھ گیا اور لیڈیز کمپارٹمنٹ والے پارٹیشن سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے لیڈیز کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا' لڑکی موجود نہیں تھی۔ ڈرائیور کے پیچھے والی تین کی سیٹ بھر چکی تھی۔ البتہ ڈرائیور کی سائیڈ والی سیٹ پر صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے ونڈ شیلڈ کے پار دیکھا۔ اسی وقت وہ اسے بیکری والی گلی سے بس کی سمت مڑتی دکھائی دی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھر جسم میں ایسی لطیف سنسنی سی دوڑی کہ وہ اندر ہی اندر بھیگ کر رہ گیا۔ اس کی چال میں بڑی نزاکت تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔

ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔ وہ ڈرائیور کو روکنا چاہتا تھا' اسے بتانا چاہتا تھا کہ تمہارا ایک پسنجر آ رہا ہے' لیکن پھر وہی ازلی خوف۔ اس کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ کیا وہ آج بھی اس کی ہم سفری سے محروم ہو جائے گا۔ یہ خیال ہی اسے سوہانِ روح معلوم ہو رہا تھا۔

بس نے ابھی رفتار نہیں پکڑی تھی۔ لڑکی نے بس رکوانے کے لئے ہاتھ لہرا کر اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیے۔ لڑکی بس میں سوار ہوئی اور ڈرائیور کی سائیڈ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ماجد کو اپنی خوش نصیبی پر رشک آنے لگا۔ اگر لڑکی آج بھی اسی سیٹ پر بیٹھتی تو وہ کسی بھی طرح اسے نہ دیکھ پاتا' نہ آئینے میں اور نہ براہ راست لیکن اب وہ اس کے روبرو تھی۔ آج درمیان میں آئینے کا پردہ بھی حائل نہیں تھا۔

وہ پُراشتیاق نگاہوں سے لڑکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ شاید اس کی نگاہوں کی چبھن نے لڑکی کو چونکا دیا تھا' تبھی تو اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں لڑکی کی نظروں میں شناسائی کی چمک ابھری لیکن لمحے بھر بعد اس نے منہ پھیر لیا۔ ماجد محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس روز اسے بس میں کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ شب گزشتہ کے تصور کی طرح۔ کبھی کبھی تصور حقیقت پر اس طرح حاوی آ جاتا ہے کہ حقیقت اپنی حقیقت کھو بیٹھتی ہے۔

لڑکی نے اس کی طرف سر گھمایا تو وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگا' لیکن لڑکی کی نظروں کی تپش اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ گدگدی کا سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کھلکھلا کر ہنس دے۔ پھر جیسے گدگدی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے'

لڑکی کی نظروں کی تپش اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ وہ لڑکی کی طرف مڑا۔ لڑکی نے تیزی سے اپنی نظروں کا زاویہ تبدیل کیا لیکن اتنی دیر میں ماجد دیکھ چکا تھا کہ لڑکی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

نگاہوں کی وہ آنکھ مچولی اس وقت تک جاری رہی' جب تک ٹائر کمپنی کا اسٹاپ نہیں آیا۔ ٹائر کمپنی پر لڑکی اتری۔ ماجد کو توقع تھی کہ وہ اترتے ہوئے اس کی طرف ضرور دیکھے گی اور وہ اسے آنکھوں کی زبانی الوداع کہہ سکے گا' لیکن لڑکی نے اسے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ بس سے اتری.......... اس نے سڑک کراس کی اور اپنے راستے پر چل دی۔ اُس کی اس بے رخی کے باوجود ماجد کے رگ و پے میں دوڑتا ہوا خوشگواریت کا احساس کم نہیں ہوا۔ اس بے رخی میں بھی ایک اپنائیت تھی۔ جیسے لڑکی بھی اس تعلق کو ساری دنیا سے مخفی رکھنا چاہتی ہو۔ صرف اسی بنیاد پر وہ کہہ سکتا تھا کہ لڑکی اس کی ہم مزاج ہے۔

دن گزرتے گئے۔ ہم سفری کا وہ حسین سلسلہ جاری رہا۔ وہ ایک دوسرے کے عادی ہوتے گئے۔ آئینے کے واسطے سے ہوں یا براہِ راست' ان کی نگاہیں ملنے کے وقفے طویل ہوتے گئے۔ اب نگاہیں ملتیں تو فوراً ہی چرا نہیں لی جاتیں۔ بلکہ اب نگاہوں کے ذریعے گفتگو ہونے لگی تھی' لیکن ماجد خوف زدہ رہتا تھا کہ کہیں یہ اس کی خوش گمانی نہ ہو۔ ممکن ہے کہ وہ رائی کو پہاڑ بنا رہا ہو' اور ممکن ہے کہ وہ رائی بھی نہ ہو۔

ایک روز ماجد بس میں اسی مخصوص نشست پر بیٹھا تھا۔ اگلی سیٹ پر لڑکی بیٹھی تھی۔ آرسی مصحف کا سلسلہ جاری تھا کہ کینٹ سے ایک خاتون بس پر سوار ہوئیں۔ وضع قطع سے وہ عیسائی لگ رہی تھیں۔ انہوں نے اسکرٹ اور بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ ان کی نظر جیسے ہی لڑکی پر پڑی' انہوں نے لہک کر اسے مخاطب کیا۔ "ہیلو ہیلن!"

لڑکی نے چونک کر خاتون کو دیکھا اور پُرتپاک لہجے میں بولی۔ "ہیلو آنٹی! ہاؤ آر یو؟"

ماجد کے لئے وہ لمحہ دھماکا خیز تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لڑکی عیسائی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے لڑکی کا نام سننے کے باوجود اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی کے انداز' اس کی وضع قطع' اس کا لباس اور سب سے بڑھ کر اس کی حیا اسے ایک مشرق لڑکی ثابت کرتی تھی۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔

لڑکی نے اس عورت کے لئے جگہ خالی کر دی تھی۔ وہ دونوں انگریزی میں گفتگو کر

رہی تھیں۔ لڑکی بھی بہت روانی سے انگریزی بول رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتی لیکن اب اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب کیفیت تھی' جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پی آئی ڈی سی کے اسٹاپ پر خاتون اتر گئیں اور لڑکی پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔ ماجد آئینے میں اس کے عکس کو تک رہا تھا لیکن اب وہ اسے ایک نئے زاویے سے' ایک نئے امکان کو سامنے رکھ کر دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف لڑکی نظریں اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس کی نگاہیں محسوس کر رہی ہے لیکن عکس کی حد تک بھی اس سے گریزاں ہے۔

وہ مسلسل لڑکی کے عکس کو گھورتا رہا۔ دل ہی دل میں اس سے نظریں اٹھانے کی التجا کرتا رہا کیونکہ اب ٹائر کمپنی کا اسٹاپ قریب آ رہا تھا۔ پھر جیسے لڑکی نے اس کی خاموش التجا سن لی۔ اس نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اس کے عکس کو دیکھا۔ اس بار بھی اس کی آنکھوں میں وہ عجیب کیفیت تھی۔ ماجد پھر الجھنے لگا۔ وہ اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر لڑکی نے نظریں جھکا لیں۔

ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اترتے وقت لڑکی نے خلافِ معمول اسے پلٹ کر دیکھا' صرف ایک ثانیے کے لئے۔ پھر وہ تیزی سے اتر گئی۔ اس نے سڑک کراس کی اور اپنے مخصوص راستے پر بڑھ گئی۔ چلتے چلتے اس نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ ماجد کھڑکی سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے میں بس چل دی لیکن لڑکی بدستور اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا سر بس کے ساتھ ساتھ متحرک تھا۔

ساجد کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے وہ نظریں الوداع کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ساتھ ہی ان میں عجیب سی سوگواری اور اداسی بھی تھی' جو آدمی کی آنکھوں میں اسی وقت جھلکتی ہے' جب وہ اپنی کسی پسندیدہ چیز کو ہمیشہ کے لئے کھو رہا ہو۔ ماجد کی طبیعت بوجھل ہو گئی۔ دفتر میں بھی وہ اداس اداس رہا۔

اس کے بعد اگلے دو روز تک صورتِ حال بدستور رہی لڑکی کی نظریں گریزاں رہیں۔ اس نے ایک بار بھی نظر اٹھا کر ماجد کو نہیں دیکھا۔ بس سے اترنے کے بعد بھی اس نے اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ماجد پر وہ دونوں دن بہت سخت گزرے۔ وہ مسلسل اس بارے میں سوچتا رہا۔ شاید اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی' شاید اس کی کوئی بات ہیلن

کو بری لگی تھی، تبھی تو وہ اس سے گریزاں ہو گئی تھی لیکن بات کیا تھی، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہیلن سے پوچھا کیسے جائے۔ اس کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ٹائر کمپنی کے اسٹاپ پر اتر کر اس سے بات کی جا سکتی تھی لیکن اس کا ازلی خوف۔

تیسرے دن بھی وہ آئینے میں اس کے عکس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس روز اسے بس میں ہیلن کے علاوہ کسی کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ وہ دل ہی دل میں التجائیں کرتا رہا۔ نہ جانے کیوں اسے یہ یقین تھا کہ اس کی خاموش التجائیں ہیلن کی سماعت تک پہنچتی ہیں۔

پھر اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ہیلن نے نظریں اٹھائی تھیں۔ وہ جھٹ مسکرا دیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس مسکراہٹ میں معذرت ہو، پشیمانی ہو، پچھتاوا ہو، اس غلطی پر، جو نادانستگی میں اس سے سرزد ہو کر ہیلن کی ناراضی کا سبب بنی ہو گی، جس سے وہ خود لاعلم تھا۔ اس مسکراہٹ کا ردِعمل بہت خوش کن اور حسین تھا۔ آئینہ جگمگا اٹھا تھا۔ ہیلن بھی مسکرائی تھی، لیکن اس کی مسکراہٹ آنکھوں تک محدود رہی تھی۔ اس لمحے کے بعد ان کے معمولات پھر لوٹ آئے تھے یہاں تک کہ آج..........

ماجد نے چونک کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ اس کی بے التفاتی کا شکوہ کرتے کرتے بجھ چکا تھا۔ اس نے سگریٹ کو نیچے پھینک کر جوتے سے مسلا۔ پھر وہ اٹھا اور کاؤنٹر پر چائے کے پیسے دے کر ریستوران سے نکل آیا۔ وہ بہت زیادہ بے کیفی محسوس کر رہا تھا۔ دفتر جانے کا موڈ نہیں تھا، چنانچہ وہ گھر کی طرف چل دیا۔ اس کا گھر ایمپریس مارکیٹ سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

☆======☆======☆

وہ کچے پکے مکانوں کی ترقی پذیر بستی تھی، جس میں کہیں کہیں جھونپڑیاں تھیں۔ ترقی پذیر اس لحاظ سے کہ گزشتہ کئی برس میں متعدد جھونپڑیاں کچے مکانوں میں اور متعدد کچے مکان پکے مکانوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہاں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ رہتے تھے لیکن بستی کی تعمیر و ترتیب سے مطلق العنانی ظاہر ہوتی تھی۔ کوئی گلی بہت چوڑی تھی تو کوئی بہت زیادہ تنگ تھی۔ کہیں کہیں چائے خانے اور پان کی دکانیں سڑکوں کے وسط تک

پھیل آئی تھیں۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک تانگوں اور سائیکلوں کا تھا اور اس پر گھوڑوں کی سوکھی لید نے بکھر کر فرش سا بچھا دیا تھا۔ دھول میں اَٹے ہوئے جسموں والے نیم برہنہ بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ گلیوں سے سڑکوں اور سڑکوں سے گلیوں تک انہی کی حکمرانی تھی۔ گھروں کے دروازوں پر کبھی کبھی کوئی عورت نمودار ہوتی اور اپنے بچے کو بے سود پکارتی۔ کسی جھونپڑی کا ٹاٹ کا پردہ سرکتا اور کوئی خاتون سر باہر نکال کر چیختی۔ "او فجو، خبیث کہاں مر گیا ہے۔ تجھے ڈھائی گھڑی کا ہیضہ آئے۔ آ جا۔" حالاں کہ اسے معلوم ہوتا تھا فجو اس کی اور اس کی چیخ کی پہنچ سے دور کسی گلی یا کسی سڑک پر دوڑ رہا ہو گا۔ پکڑم پکڑی کھیل رہا ہو گا پھر وہ مایوس ہو کر بڑبڑاتی۔ "کم بخت نے زندگی حرام کر دی ہے میری تو۔" بخت کہتے ہوئے وہ "ب" کو ایک زبر کے ساتھ متحرک کرتی اور "خ" کو مزید ایک زبر کے ذریعے "ت" سے ملا دیتی۔ اس کے بعد اس کا سر ٹاٹ کے پردے کے پیچھے غروب ہو جاتا اور ٹاٹ کا پردہ برابر ہو جاتا۔ یہ سب کچھ وہاں کے معمولات میں شامل تھا۔

ماجد کو اپنی اس بستی اور اس کے باسیوں سے بہت پیار تھا۔ وہ انہی تنگ و تاریک گلیوں میں پلا بڑھا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ اس کے گھر کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ اس کے والد کا شمار علاقے کے چند گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا، جو تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے علاقے کے سب سے زیادہ قابلِ احترام لوگ تھے۔ بستی کے تمام لوگ انہیں دانشور سمجھتے تھے اور اپنا ہر مسئلہ ان لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور ان لوگوں کو بابو جی کہہ کر پکارتے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن وہ اپنے بچوں کو تعلیم سے دور رکھنے پر مجبور ہوتے۔ اس لئے کہ وہ غربت کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی زندگی کا فلسفہ نہایت سادہ تھا۔ تعلیم پر ہنر کو فوقیت حاصل تھی، کیوں کہ تعلیم میں پلے سے جاتا تھا جب کہ ہنر سے ان کی غربت میں کمی واقع ہوتی تھی۔ بچہ ویلڈنگ یا لیتھ کا کام سیکھتا تو گھر میں چار پیسے آتے اور مستقبل میں اچھی آمدنی کا امکان نظر آتا۔ وہ سب بے حد عملی لوگ تھے۔ انھیں پتا بھی نہیں تھا کہ زندگی نے انھیں برت برت کر کتنی اہم تعلیم دی ہے۔ تعلیم اسناد سے مشروط کہاں ہوتی ہے۔

وہ بستی صرف رہن سہن کے اعتبار سے ترقی پذیر نہیں تھی۔ ماجد کو خوب یاد تھا کہ بچپن میں جب وہ اسکول جاتا تھا تو وہ علاقے کے دس بیس بچوں میں سے ایک تھا۔ اپنی گلی

کے اٹھارہ گھروں میں سے وہ اسکول جانے والا واحد لڑکا تھا' لیکن اب صبح اور دوپہر کو لڑکے اور لڑکیاں یونیفارم پہنے جوق در جوق اسکول جاتے نظر آتے۔ تاہم کام پر جانے والے لڑکوں کی تعداد اس سے زیادہ ہوتی اور دن بھر گلیوں اور سڑکوں پر غل غپاڑہ کرنے والے بچوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔

وہ سر جھکائے سڑک پر چلتا رہا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ہیلن کا خیال تھا۔ وہ اپنی گلی میں مڑ ہی رہا تھا کہ نکڑ کے پان والے نے آواز لگائی۔ "اوہو' مجید بابو ہیں۔ دفتر نہیں گئے آج؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ ہمیشہ اسے مجید ہی کہتا تھا۔

"سب ٹھیک ہے رحیمو چاچا!" اس نے بجھے بجھے لہجے میں جواب دیا۔ "بس......... جی ہی نہیں چاہا جانے کو۔"

"یہی تو مزے ہوتے ہیں بابو لوگوں کے۔ جب جی چاہا چلے گئے' جب جی چاہا آ گئے۔" پان والے نے خوش دلی سے کہا۔

پان والے کے لہجے میں طنز نام کی کوئی چیز نہیں تھی' پھر بھی ماجد خفیف ہو کر رہ گیا۔

وہ سر جھکائے گلی میں داخل ہوا۔ گلی سنسان تھی۔ کہیں کوئی بچہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اپنے دروازے پر پہنچ کر اس نے تالا دیکھا۔ شاہد تو اس کے سامنے ہی اسکول چلا گیا تھا۔ تالے کا مطلب تھا کہ امی' ثمینہ اور زرینہ کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہیں اور گیارہ بجے تک یقیناً واپس آ جائیں گی۔ کیونکہ ثمینہ اور زرینہ کو اسکول جانا ہوگا۔ اس بات کا امکان کم ہی تھا کہ وہ پڑوس میں چابی دے گئی ہوں۔ کیوں کہ یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ وہ اتنی جلدی واپس آ جائے گا۔ شاہد کی واپسی ویسے بھی ایک بجے سے پہلے نہیں ہوتی۔ ابا کی واپسی کا بھی کوئی سوال نہیں تھا' کیوں کہ وہ دفتری معاملات میں پابندی وقت کا بہت خیال رکھتے تھے۔

امکان نہ ہونے کے باوجود چابی کے متعلق پوچھ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ چابی مل گئی تو خیر' ورنہ چائے خانہ تو ہے ہی۔ یہ سوچ کر اس نے شمو خالہ کے دروازے کی کنڈی بجا دی۔ دروازہ خالہ کی بڑی لڑکی نمی نے کھولا۔ نام تو اس کا نعیمہ تھا لیکن سب اسے نمی ہی کہتے تھے۔

"آہا......... ماجد بھائی ہیں۔ جلدی گھر آ گئے آج؟" نمی نے لہک کر کہا لیکن اس

کی آنکھوں کی گفتگو اور طویل تھی۔ ماجد نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ نمی کوئی حسین لڑکی نہیں تھی لیکن ہر لڑکی پر ایک ایسا موسم ضرور آتا ہے' جب وہ حسین نہ ہوتے ہوئے بھی حسین لگتی ہے۔ دل میں اتار لینے کے قابل۔ نمی بھی اسی موسم بہار سے گزر رہی تھی۔

"شش......... شمو خالہ کہاں ہیں؟" ماجد نے گڑبڑا کر پوچھا۔

"وہ تو خالہ ثمینہ اور زرینہ کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ میں گھر میں اکیلی ہوں۔" نمی نے دوسرے جملے پر خاص طور پر زور دیا۔

"امی چابی دے کر گئی ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔ اسے نمی کی نظروں کی چبھن کا شدید احساس تھا۔ اسی لئے وہ جلدی سے کھسک لینا چاہتا تھا۔

"جی......... چابی تو وہ دے کر گئی ہیں۔" نمی نے جواب دیا لیکن دروازے سے نہیں ہٹی۔

"تو چابی لا دو مجھے۔" ماجد نے خشک لہجے میں کہا۔

وہ بدستور کھڑی رہی۔ "وہ......... ماجد بھائی! آپ بڑے موقع سے آئے ہیں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

ماجد خاموش کھڑا مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"وہ مجھے اوپر بریکٹ پر سے صندوقچی اتارنا تھی۔ بریکٹ بہت اوپر ہے اور اسٹول ہل رہا ہے۔"

ماجد کو اس کی آواز میں خفیف سی لرزش محسوس ہوئی لیکن وہ اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ "تو میں کیا کروں؟" اس نے جھلا کر کہا۔

"میری مدد کر دیں نا......... پلیز......... اچھے بھائی!"

ماجد پگھل گیا۔ یہ وہی لہجہ تھا' جس میں ثمینہ اور زرینہ اس سے التجا کرتی تھیں۔

"چلو' تم بھی کیا یاد کرو گی۔" اس نے کہا۔ نمی جھپاک سے اندر بھاگ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ نمی مکان کے اکلوتے کمرے میں کھٹر پٹر کر رہی تھی۔ وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ نمی بریکٹ کے قریب اسٹول رکھ رہی تھی۔ بریکٹ ایک فٹ چوڑا ہو گا اور خاصی بلندی پر تھا۔

"ٹھہرو' میں دیکھتا ہوں۔ شاید اسٹول پر چڑھے بغیر ہی کام بن جائے۔ کہاں ہے

تمہاری صندوقچی؟"

"وہ......... وہ بالکل پیچھے ہے۔ اسٹول پر تو چڑھنا پڑے گا۔" نمی نے کہا۔

"اچھا تو میں چڑھوں؟" ماجد نے پوچھا۔

"نہیں' یہ اسٹول آپ کو تو برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ گر جائیں گے۔"

ماجد نے اسٹول کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ واقعی بری طرح ہل رہا تھا۔ "یہ تو واقعی مخدوش ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تم بھی گر جاؤ گی۔"

"آپ مجھے گرا دیں گے؟"

"میں نہیں گراؤں گا' اگر تمہیں گرنا ہے تو تم خود گرو گی اپنی وجہ سے۔"

نمی جھنجھلا کر کچھ کہنے کے لئے پلٹی......... ڈگمگائی اور سیدھی ماجد کے اوپر آئی۔ ماجد نے جبلی طور پر ہاتھ اوپر کر کے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ نمی کی بانہیں اس کی گردن سے لپٹیں۔ اس کے باوجود وہ سنبھلی نہیں بلکہ ماجد سمیت دری اور چاندنی کے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ ماجد کے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اس نے بوکھلا کر نمی کو ایک طرف دھکیل دیا اور تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ غرایا۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" نمی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ماجد جانتا تھا کہ نمی کی عمر بمشکل چودہ سال ہو گی۔ وہ کبھی اسکول نہیں گئی تھی۔ ان کے گھر میں ٹیلی ویژن تو کجا ریڈیو بھی نہیں تھا۔ عام طور پر وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ قد کاٹھ کی وہ اچھی تھی اور اس پر شاید بہار بھی قبل از وقت آئی تھی لیکن پھر بھی وہ بچی ہی تھی۔ پھر یہ سب کچھ اس نے کہاں سے سیکھا؟

ماجد کو بڑے زور کا غصہ آیا۔ "کیسے پتا ہے تمہیں؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"بس پتا ہے مجھے' بہت دنوں سے' بلکہ کئی سال سے۔" نمی نے جواب دیا۔ لیکن وہ سہم گئی تھی۔ اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"مجھے بتاؤ' کیسے پتا چلا تمہیں یہ سب' بتاؤ؟ ورنہ میں تمہاری پٹائی کر دوں گا۔" ماجد غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔

نمی اور سہم گئی۔ اس نے ماجد کو بہت دیکھا تھا لیکن اس سے پہلے اسے کسی سے بھی اس انداز میں بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ تو بچوں سے بھی بڑی محبت سے بات کرتا

تھا۔ اس کی نرم اور مہربان طبیعت کی تو محلے میں مثالیں دی جاتی تھیں۔ اپنے گھر میں بھی بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود وہ کبھی اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔

"بولتیں کیوں نہیں۔ جواب دو۔" وہ پھر دہاڑا۔

"وہ......... ابا......... امی........." وہ بری طرح ہکلا کر رہ گئی۔

اس کے شرم سے تمتماتے چہرے' اور لرزیدہ آواز نے ماجد کو اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اس کا لہجہ' اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ اب بھی معصوم ہے' لیکن وہ معصومیت ایسی تھی کہ کسی بھی وقت پامال ہو سکتی تھی۔ وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ ایک کمرے کے مکان' یہ تنگ جھونپڑیاں' یہ غربت کی مجبوریاں انسانی فطرت کے سامنے بند تو نہیں باندھ سکتیں۔ وہ سوچتا اور لرزتا رہا۔ یہ سب کیا ہے' کیوں ہے اور دور تک......... بہت دور تک اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ لیکن اس کے پاس سوال ہی سوال تھے' جواب ایک بھی نہ تھا۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان سوالوں کے جواب کون دے گا۔

زندگی میں پہلی بار اسے اس علاقے سے وحشت ہوئی۔ اس کی بھی دو بہنیں تھیں۔ ثمینہ تو نمی ہی کی ہم عمر تھی۔ یہ بات اطمینان بخش تھی کہ اس کا گھر مضبوط بنیادوں پر قائم تھا' کشادہ تھا۔ اس اعتبار سے نمی پرائی آگ تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ آگ کی فطرت میں پھیلنا بھی ہے۔ اسے بجھایا نہ جائے تو وہ اپنے اردگرد کی چیزوں کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ انسان معاشرے سے کٹ کر تو نہیں رہ سکتا۔ نمی کی اس کی دونوں بہنوں سے دوستی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اس کے گھر میں آتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی ثمینہ اور زرینہ نمی کے گھر بھی چلی جاتیں لیکن ایسا کم ہوتا تھا۔ امی کی سختی کی وجہ سے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب یہ سلسلہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ وہ نمی سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ آئندہ کبھی اس کے گھر بھی نہ آئے' لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ کیا اس کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے گا؟ اس نے خود سے پوچھا۔ کیا اس طرح نمی کی تباہی یقینی نہیں ہو جائے گی اور اس تباہی کے ذمے داروں میں وہ بھی شامل ہو گا۔ معصوم بچوں پر وقت سے پہلے آگہی کا عذاب اتر رہا تھا۔ اس میں قصور وار کون ہے؟ بچے؟ والدین؟ معاشرہ؟ کون ہے قصور وار؟ مزید سوالات......... اور جواب ندارد۔ وہ بری طرح جھنجھلا گیا۔

نمی اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "آپ مجھ سے بہت زیادہ ناراض ہیں؟"

اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"آں.........." ماجد بری طرح چونکا۔ "نہیں ہونا چاہیے ناراض؟ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"میرا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ.........." نمی نے پھر نظریں جھکا لیں۔

"نہیں گڑیا.......... دل کی ہر خواہش تو درست نہیں ہوتی۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور کچھ شرطیں بھی پوری کرنا ہوتی ہیں۔" ماجد نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "تمہیں پتا ہے، آج اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا.......... مجھ سے بھی خراب آدمی، تو پتا ہے، تمہیں کتنا بڑا نقصان ہوتا تم کہیں کی بھی نہیں رہتیں پگلی.........."

"کیسے ہوتا کوئی اور؟" نمی یکلخت بپھر گئی۔ "مجھے تو بس آپ اچھے لگتے ہیں.......... صرف آپ۔ اگر آپ کو برا لگا ہے تو خدا کی قسم، آئندہ ایسا کبھی نہیں کروں گی۔"

"ہاں۔ مجھے بہت برا لگا ہے۔"

"قسم سے آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گی بس آپ اتنا کہہ دیں کہ آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔"

"ایسی باتیں بھی نہیں کرتے۔"

"اب نہیں کروں گی لیکن میں آپ کا انتظار کروں گی ہمیشہ۔"

"میں تمہیں اپنی ثمینہ کی طرح سمجھتا ہوں۔ اچھا لاؤ اب چابی دو۔" ماجد نے کہا۔

نمی نے اسے چابی دی۔ وہ چابی لے کر نکل آیا۔ اپنے دروازے کا تالا کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا، جسے بطور بیٹھک بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ تھکے تھکے سے انداز میں بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایش ٹرے اپنے قریب کھینچ لی۔

اسے بیڈ پر دراز ہوئے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے سوچا، کون گھوم کر دروازے تک جائے۔ بیٹھک کا بیرونی دروازہ بھی گلی میں کھلتا تھا۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ آنگن والے دروازے پر ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ عورت کی پیٹھ اس کی طرف تھی البتہ مرد کا چہرہ ایک رخ سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بہت سی کتابیں تھیں۔ عورت کے ہاتھ میں

صرف ایک پرس تھا۔

"جی فرمایئے۔" ماجد نے وہیں سے انہیں پکارا۔

مرد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسی وقت عورت بھی اس کی طرف مڑی، لیکن وہ عورت نہیں، لڑکی تھی.......... اور لڑکی بھی کون! وہ ہیلن تھی۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ہیلن کو دیکھتا رہا۔ ہیلن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور نہ جانے کیوں اس کے شاداب چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ ان دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ہیلن کی نگاہوں میں اس لمحے وہی کیفیت تھی، جو ماجد کو اس دن نظر آئی تھی، جب اتفاقاً اسے ہیلن کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس روز وہ اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن اس لمحے اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ ہیلن کی نگاہوں میں جو کیفیت تھی، اسے صرف خوف کہا جا سکتا تھا اور وہ یقیناً اسے کھونے کا خوف تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں۔ گویا اس کی حماقت یک طرفہ نہیں تھی۔ ہیلن بھی اس میں مبتلا تھی۔ پھر اس نے غور کیا کہ اس خوف کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں یہ خوف اس وقت دیکھا تھا، جب اسے اس کا نام معلوم ہوا تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ پھر اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا اور بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ نام معلوم ہونے کا مطلب یہ معلوم ہونا تھا کہ ہیلن عیسائی ہے، یوں ہیلن کو خوف ہوا ہوگا کہ اب وہ اس سے دور ہو جائے گا۔ اسی لئے وہ اس دن کے بعد کئی روز تک اس سے آنکھیں ملانے سے بچتی رہی تھی، لیکن آج کے خوف کی وجہ؟ وہ ایک لمحے میں سب کچھ سوچ گیا۔

ہیلن بھی سحرزدہ سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا ساتھی مرد کچھ نروس سا تھا۔ شاید اسی لئے وہ ان دونوں کی بصری گفتگو سے بے خبر رہا۔ پھر وہ ماجد کی طرف بڑھا۔ یوں نظروں کا وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ہیلن بھی اپنے ساتھی کے پیچھے چلتی بیٹھک کے دروازے تک آ گئی۔ ماجد اب پوری طرح مرد کی طرف متوجہ تھا۔ اسے اپنی از خود رفتگی پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر اسے کچھ سکون ہوا کہ ہیلن کے ساتھی نے یہ بات محسوس نہیں کی ہے۔

"فرمایئے؟" اس نے رسماً دہرایا۔

"کیا آپ ہمیں بیٹھنے کے لئے نہیں کہیں گے؟" مرد نے بڑی شائستگی سے کہا۔

عام حالات میں شاید ماجد بڑی رکھائی سے پہلے تعارف کا مطالبہ کرتا......... لیکن ہیلن کی اپنے گھر آمد تو اسے اعزاز محسوس ہو رہی تھی۔ ویسے اس آمد کی وجہ وہ اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ اگر مرد کے انداز میں ذرا بھی برہمی یا کشیدگی ہوتی تو وہ اسے آمد برائے گوشمالی تصور کرتا' اس یقین کے ساتھ کہ ہیلن اسے اس کی خوش فہمی کی سزا دینے آئی ہے' لیکن یہاں تو انداز بے حد پُرتپاک تھا۔ "ضرور' تشریف لائیے۔" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ ہیلن نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ثانیے کے لئے اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی وہی خوف تھا۔ وہ خوف ماجد کے لئے پریشانی اور الجھن کا باعث تھا' لیکن ہیلن کے لباس سے اٹھنے والی جانی پہچانی مہک نے اسے مسحور کر لیا۔ اس نے دروازہ کھلا چھوڑا اور اندر آ گیا۔ وہ دونوں کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔

"تشریف رکھیے۔" ماجد نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ مرد نے آہستہ سے شکریہ کہا۔

"اب فرمائیے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ماجد نے مرد سے پوچھا لیکن اس کی نگاہوں کا مرکز ہیلن ہی تھی۔

"دیکھیے' ہم ایک کارِ خیر کے سلسلے میں آپ سے مدد کی درخواست کرنے آئے ہیں۔" مرد نے کہا۔ "ہمارا مشن دکھی انسانیت کی خدمت ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں فنڈ درکار ہوتے ہیں۔ یہ جو کتابیں میرے ہاتھ میں ہیں' یہ راہ بھٹکے ہوؤں کے لئے رہنمائی کی روشنیاں ہیں۔ یہ ہماری مطبوعات ہیں۔ آپ اپنی حیثیت کے مطابق ان کا جو ہدیہ دیں گے' وہ انسانیت کے کام آئے گا۔ آپ کچھ نہیں دیں گے' تب بھی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ روشنی کبھی بیچی نہیں جاتی۔ سب کچھ آپ کی خوشی پر ہے۔"

ماجد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہیلن کا چہرہ اب سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنا چھوٹا سا پرس صوفے کے ساتھ رکھی تپائی پر رکھنا چاہا لیکن وہ نیچے گر گیا۔ ہیلن نے پرس اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی انگلیاں چٹخاتی رہی۔ اب وہ اس سے نظریں بھی نہیں ملا رہی تھی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" ماجد نے کہا۔

مرد نے چار کتابیں منتخب کیں اور اس کی طرف بڑھا دیں۔ "آپ انھیں دیکھئے تو سہی۔" اس نے التجا کی۔

ماجد نے اس کے ہاتھ سے کتابیں لے کر ان کا جائزہ لیا اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ مشنری لٹریچر تھا' تبلیغ و ترویج مسیحیت کے سلسلے میں پھیلایا جانے والا لٹریچر۔ "میں اس سے انکار نہیں کروں گا کہ یہ کتابیں روشنی ہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "یقیناً ہوں گی لیکن ان کے لئے جو خورشیدِ ہدایت سے محروم ہیں۔ جن کے دل و دماغ اور آنکھیں بصیرت سے عاری ہیں۔ میری رہنمائی کے لئے وہ کتاب الٰہی کافی ہے۔" اس نے اپنی الماری میں رکھے کلام پاک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اپنا یہ ردِ عمل خود اس کے لئے بھی حیرت انگیز تھا۔ وہ تو پیدائشی مسلمان تھا اور بس۔ مذہب کی طرف اس کا رجحان کبھی نہیں رہا تھا۔ آج یہ جذباتیت نہ جانے کتنی تہیں چیر کر باہر نکل آئی تھی۔ اس نے ہیلن کی طرف برہمی سے دیکھا۔ ہیلن کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ نہ جانے کیوں اسے ہیلن پر ترس سا آ گیا۔ وہ بہت پشیمان نظر آ رہی تھی لیکن مرد پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اب تو وہ مسکرا رہا تھا۔

"جذباتیت کمزوری کا ثبوت ہوتی ہے جناب۔" مرد نے کہا۔ "آدمی کو ہمہ وقت حق کی جستجو کرتے رہنا چاہئے۔ اس کے لئے مطالعہ اور موازنہ ضروری ہے۔ آپ بے شک ہدیہ نہ دیں لیکن کتابوں کو پڑھ کر تو دیکھیں۔"

"حق کی جستجو وہ کرے' جو اوہام میں الجھا ہوا ہو۔" ماجد نے تند لہجے میں کہا اور کتابیں واپس کر دیں۔ "میرا مذہب دنیا کا کامل ترین مذہب ہے۔ میں سورج کے بدلے وہ چراغ کیوں لوں' جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔"

"آپ میری بات.........."

"بس جناب!" ماجد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ اس وقت میرے گھر میں ہیں' اس لئے قابل احترام ہیں' لیکن اب میں اس سلسلے میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اس وقت گھر والے موجود نہیں ہیں ورنہ میں یقیناً چائے پلواتا آپ کو' لیکن پلیز......... آپ مجھے کسی کڑے امتحان میں نہ ڈالیں' اور اگر یہ گفتگو آپ کے لئے ضروری ہے تو ازراہِ

مہربانی یہاں سے تشریف لے جائیں۔"

"بہت بہتر۔" مرد اٹھ کھڑا ہوا۔ "لیکن ہم کبھی مایوس نہیں ہوتے' اس لئے میں آپ سے بداخلاقی کی شکایت بھی نہیں کروں گا۔"

ہیلن بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماجد نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔ ہیلن نے فوراً نظریں جھکالیں۔

"میں نے آپ سے بداخلاقی کی بھی نہیں ہے۔" ماجد نے کہا۔ "لیکن ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ آئندہ اس مکروہ ارادے کے ساتھ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کیجئے گا۔"

اس بار مرد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ تاہم وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گیا۔ ہیلن بھی اس کے پیچھے تھی۔ ان کے باہر نکلتے ہی ماجد نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ پھر بستر پر دراز ہو گیا' لیکن اس بار اس کا ذہن بہت زیادہ منتشر تھا۔ ہیلن سے ملاقات ہوئی بھی تو کس ماحول میں! اسے افسوس بھی تھا اور ہیلن پر غصہ بھی آ رہا تھا' لیکن ہیلن کی کیفیت اور اس کے تاثرات یاد آتے تو اس کا غصہ زائل ہو جاتا۔ اسے سر میں بھاری پن کا احساس ہونے لگا۔ یہ چائے کی طلب کی علامت تھی لیکن اس وقت اس پر سستی بھی سوار تھی۔ وہ کچن میں جا کر خود چائے بنانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور اس صوفے کی طرف بڑھ گیا جس پر ہیلن بیٹھی تھی۔ اچانک اسے صوفے اور تپائی کے درمیان ہیلن کا پرس نظر آیا۔ اس نے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کچھ سوچ کر رک گیا۔ جی چاہتا تھا کہ پرس کھول کر اس کا جائزہ لے' لیکن یہ بددیانتی ہوتی اور وہ کم از کم مشنری کی کسی مبلغہ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دوبارہ بیڈ پر آ لیٹا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا دس بجے تھے۔ امی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔

وہ سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا اور راکھ ایش ٹرے میں جھٹکتا رہا۔ اچانک ایک خیال نے اسے چونک کر اٹھ بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ہیلن یقیناً واپس آئے گی' اپنا پرس لینے۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دل ایسی تیزی سے دھڑکا گویا تڑپ کر باہر نکل آئے گا۔ جسم میں خوشگوار سی سنسنی کی لہر دوڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے سارا ہیجان سرد ہو گیا۔ وہ مسیحیت کی تبلیغ کرنے اس کے گھر آئی تھی۔ اسے غصہ آنے لگا۔ پھر اس نے سوچا کہ ہیلن نے تو

اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ وہ ہیلن سے چڑ بھی رہا تھا اور اس کا منتظر بھی تھا۔

کوئی پندرہ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ بیٹھک کے دروازے پر۔ وہ اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ حسب توقع وہاں ہیلن موجود تھی۔ زرد چہرہ جھکی ہوئی آنکھیں۔

"معاف کیجئے گا......... میرا پرس شاید یہیں کہیں رہ گیا ہے۔" ہیلن نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"آیئے' خود ہی دیکھ لیجیے۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ خود کو فریب دے رہا تھا کہ وہ اسے زحمت دے کر اس سے بدلہ لے رہا ہے۔ حالاں کہ وہ دل کی خواہش پوری کر رہا تھا کہ وہ اندر آ جائے۔ ورنہ وہ اس سے یہ بھی تو کہہ سکتا تھا کہ آپ یہیں ٹھہریئے میں ابھی آپ کا پرس لا دیتا ہوں۔

ہیلن صوفے کی طرف گئی اور اس نے اپنا پرس اٹھا لیا پھر وہ ہچکچاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی' لیکن درمیان میں ہی رک گئی۔ اسی وقت آنگن والے دروازے پر دستک ہوئی۔ ماجد نے آگے بڑھ کر دروازے سے جھانکا۔ نمی ہاتھ میں چائے کی پیالی لئے کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟" ماجد نے درشت لہجے میں پوچھا۔ اس کا سوال فضول تھا کیوں کہ جواب اسے معلوم تھا۔

"چائے لائی ہوں آپ کے لئے۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید نمی کی تازہ ترین حرکت کی وجہ سے ماجد وہ چائے قبول نہ کرتا' لیکن اس وقت تو وہ عجیب نفاق سے دوچار تھا۔ ایک طرف ہیلن سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا' دوسری طرف اسے سزا بھی دینا چاہتا تھا۔ اسے ہیلن کا تبلیغ کے لئے آنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"یہیں لے آؤ۔" اس نے نمی کو پکارا۔

نمی بیٹھک کی طرف چلی آئی' لیکن دروازے ہی پر ٹھٹک گئی۔ "اوہ......... تو یہ بھی ہیں یہاں!" اس نے حیرت سے کہا۔

"تم انہیں جانتی ہو کیا؟" ماجد نے ہیلن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نمی سے پوچھا۔

"ابھی دس منٹ پہلے دیکھا تھا۔ یہ ایک صاحب کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ صاحب بولتے تھے' کچھ باتیں کرنا ہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ اس وقت گھر پر کوئی نہیں ہے' بعد میں آنا' ٹھیک کیا نا؟"

"بہت اچھا کیا۔" ماجد نے بڑی محبت سے کہا۔ "لیکن مجھ سے حماقت ہو گئی کہ میں نے انہیں اندر بلا لیا۔"

خفت کے مارے ہیلن کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن وہ خاموش رہی۔

"چائے لاؤں آپ کے لئے؟" نمی نے ہیلن سے پوچھا۔

"نہیں' شکریہ۔"

ماجد' ہیلن کی طرف مڑا۔ "یہ نعیمہ ہے۔" اس نے نمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسے پیار سے نمی کہتا ہوں۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔" اس وقت وہ صرف ہیلن کو تکلیف پہنچانا چاہتا تھا۔

نمی نے حیرت سے اسے دیکھا' پھر شرما کر نظریں جھکا لیں۔ "اب میں چلتی ہوں۔ گھر اکیلا ہے۔" اس نے کہا اور جواب کا انتظار کئے بغیر بھاگ گئی۔

نمی کے جانے کے بعد ہیلن نے ماجد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پرس کا تو بہانہ تھا' درحقیقت میں آپ سے معذرت کرنے آئی تھی۔" وہ بہت صاف اردو بول رہی تھی۔ ماجد کو بے حد حیرت ہوئی۔

"معذرت! کس بات کی معذرت؟" ماجد نے ترش روئی سے پوچھا۔

"جو کچھ ہوا' اس پر معذرت۔ میں تو یوں بھی مائیکل کے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھی' لیکن پاپا نے زبردستی مجھے بھیج دیا۔ اس کے لئے مجھے آفس سے بھی چھٹی کرنا پڑی۔"

ماجد کو اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اور لہجے میں سچی معذرت محسوس ہوئی اس کا دل یک لخت موم ہو گیا۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میں تبلیغ کے چکر میں کبھی نہیں پڑتی۔ میں تو خود حق کی جستجو میں ہوں۔ میں کسی کو کیا راستہ دکھاؤں گی' اور پھر آپ کے سامنے اس انداز میں آنا' مسٹر.........؟"

ماجد کو پہلی بار خیال آیا کہ لڑکی تو اس کا نام بھی نہیں جانتی۔ "اوہ......... میرا نام ماجد ہے......... ماجد رشید۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"ماجد۔" لڑکی نے خود کلامی کے سے انداز میں دہرایا۔ "ماجد۔" ایسا لگتا تھا کہ وہ اس نام کو اپنے وجود میں اتار رہی ہے......... سانسوں کے ذریعے......... دھڑکنوں میں بسا رہی ہے۔

ماجد کو اس کے منہ سے اپنا نام سننا بہت اچھا لگا۔

"ماجد......... میں پہلے ہی جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن میں آپ کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ اب اس انداز سے آپ کے سامنے آنے کے بعد......... خیر چھوڑیئے۔ آئی ایم سوری......... ایکسٹریملی سوری۔"

ماجد کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ ہیلن جو کچھ کہہ رہی تھی' اس کا صریحاً ایک ہی مطلب تھا اور وہ مطلب اس کے لئے بے حد خوش آئند تھا۔ خوشی کا وہ لمحہ تتلی کی طرح اس کی انگلیوں پر رنگ چھوڑ کر اڑنے والا تھا۔ اسے اس لمحے کو گرفت میں لینا تھا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میری نظروں میں تو آپ اب بھی ویسی ہی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں' میں آپ سے کتنی........." اس سے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

ہیلن نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پہلے وہ نظریں حقیقت کو ٹٹولتی محسوس ہوئیں' بڑی بے یقینی کے ساتھ۔ پھر ان میں حیرانی جھلکی اور اس کے بعد ان میں ایک بے نام سی مسرت چمکی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور کمرہ جیسے جگمگا اٹھا۔ وہ چند لمحے انتظار کرتی رہی۔ پھر بولی۔ "آپ اپنا جملہ مکمل نہیں کریں گے؟"

ماجد بوکھلا گیا۔ "آ......... آپ تشریف رکھیے نا......... پلیز......... تھوڑی دیر بیٹھ جایئے' میری خاطر۔"

ہیلن بیٹھ گئی۔ "اچھا' تو جو میں سننا چاہتی ہوں' وہ آپ کہنا نہیں چاہتے۔" اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں۔" ماجد نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

"کہنے سے آدمی کمٹ ہو جاتا ہے۔ اس کے کمٹمنٹ سے دوسرے آدمی کو سیکورٹی

ملتی ہے پلیز.......... آپ اسے اصرار نہ سمجھئے۔ میں جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر آدمی اپنی طبیعت سے مجبور ہوتا ہے' جیسے میں ہوں۔ میں دل کی بات دل میں نہیں رکھتی' ہر حال میں متعلقہ شخص تک پہنچاتی ہوں۔ اب چاہے آپ برا سمجھیں' میں کہے بغیر نہیں رہوں گی۔ آئی ایم ان لو ودھ یو۔ آئی ہیو نو کنٹرول اوور مائی سیلف سنس آئی ہیو سین یو دی فرسٹ ٹائم۔ بٹ.......... میں ڈرتی ہوں۔"

ماجد سناٹے میں آ گیا۔ انگریزی میں اظہارِ محبت کتنا آسان تھا۔ ہیلن نے اپنے دل کا بوجھ کتنی آسانی سے اتار دیا تھا۔ اسے ہیلن پر رشک آنے لگا۔ وہ تو یہ سب کچھ سن کر دہرانے کی ہمت بھی نہیں رکھتا تھا۔ "آپ ڈرتی ہیں' کس سے؟" اسے نے پوچھا۔

"خود سے' آپ سے' اردگرد کے سارے لوگوں سے' آپ کے لوگوں سے' اپنے لوگوں سے' اپنے اور آپ کے مشترک جذبے سے۔" ہیلن نے کہا۔

"کیوں؟ ڈرنے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ جذباتی ہیں۔ اب آپ کا یہ سوال یہ بات ثابت کر رہا ہے۔ جذباتی لوگوں میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔"

"تو آپ جذباتی نہیں ہیں؟"

"نہیں' میں اینا لائیٹیکل ہوں۔ آپ جذباتی ہیں۔ اسی لئے میرا ڈر اور بڑھ گیا ہے۔"

"لیکن میں اس کی وجہ اب بھی نہیں سمجھا۔"

"دیکھیے میرے اور آپ کے درمیان ایک بُعد بھی ہے.......... اور آپ کی جذباتیت اسے کسی بھی لمحے بڑھا سکتی ہے۔ سو آئی فیل ان پروٹیکٹڈ اینڈ ولنریبل۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" ماجد نے جلدی سے کہا۔ قریب سے دیکھنے اور باتیں کرنے پر وہ اور پیاری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"حالاں کہ کچھ دیر پہلے آپ اپنے رویئے سے یہ بات ثابت کر چکے ہیں۔"

"تو کیا میں اپنے گھر میں مسیحیت کی تبلیغ کی اجازت دے دوں؟" ماجد بھڑ گیا۔

"دیکھیں' آپ پھر جذباتی ہو گئے۔" ہیلن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے زندگی میں کبھی مسیحیت کی تبلیغ نہیں کی' کر بھی نہیں سکتی۔ میں نے تو آپ سے ایک لفظ بھی

نہیں کہا لیکن آپ نے مائیکل کے ساتھ مجھے بھی ذلیل کیا۔ دوسری طرف میں جذباتی نہیں ہوں اور آپ سے تعلق بھی محسوس کرتی ہوں۔ آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی لیکن میں نے تعلق خاطر کی اہمیت کے پیش نظر نا صرف اسے نظرانداز کر دیا بلکہ آپ سے معذرت کرنے کے لئے دوبارہ چلی آئی۔ سچ کہیں' آپ میری جگہ ہوتے تو ایسا کر سکتے تھے؟"

سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ماجد کو ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ "آئی ایم سوری۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ نے ناول دا لو اسٹوری پڑھا ہے؟" ہیلن نے اس کی معذرت کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پڑھیے گا۔ اس میں ایرک سیگل نے ایک آفاقی مکالمہ دیا ہے۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "اگر آپ اسے ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کریں تو سناؤں۔"

ماجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ مکالمہ ہے۔ لو مینز نیور ہیونگ ٹو سے' یو آر سوری۔"

ماجد کو اس مکالمے کی معنویت نے دہلا دیا۔ "لیکن آپ تو خود مجھ سے معذرت کرنے آئی ہیں۔" اس نے اعتراض کیا۔

"صرف اس لئے کہ آپ سے ملنے کی یہی ایک صورت تھی۔" ہیلن نے بے حد سادگی سے کہا۔

ماجد گنگ ہو کر رہ گیا۔

"اچھا' اب میں چلتی ہوں۔" ہیلن اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماجد بھی مضطربانہ اٹھ گیا۔ "پھر کب ملیں گی؟" اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

ہیلن نے نظریں اٹھا کر اسے بغور دیکھا۔ "مجھ سے ملنا چاہتے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔ ہر روز۔"

"جس وقت اور جہاں کہیں گے' مل جاؤں گی۔ میں آپ کے ماحول کی لڑکی تو نہیں ہوں کہ چھپ چھپ کر ملوں۔"

ہیلن کے لہجے میں شاید خفیف سا طنز تھا' لیکن ماجد کو اب کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ "کل شام چھ بجے کیفے اوڈین کے سامنے میں آپ کا انتظار کروں گا۔" اس نے کہا۔

"اوکے۔ سی یو دین۔" ہیلن نے کہا۔ پھر اس کی نظر چائے کی پیالی پر پڑی جو اب بھی ماجد کے ہاتھ میں تھی۔ "چچ چچ......... اتنی محبت سے بنائی گئی چائے آپ نے ٹھنڈی کر دی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

ماجد نے پیالی کو دیکھا۔ چائے واقعی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ "میں تو یہ چائے قبول بھی نہ کرتا۔" اس نے کہا۔ "بس ذرا آپ.........."

"میں جانتی ہوں۔ آپ نے انتقاماً یہ چائے قبول کی تھی۔" ہیلن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوکے......... بائی۔" پھر وہ ماجد کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہوا کے جھونکے کی طرح بیٹھک سے نکل گئی۔

☆======☆======☆

اس رات ماجد بہت دیر تک سو نہیں سکا۔ ہیلن کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ اس کی باتیں اس کی سماعت میں رس گھولتی رہیں۔ درحقیقت وہ تھی بھی ایسی ہی کہ اس کے بارے میں عمر بھر سوچا جا سکتا تھا۔ ماجد اس کی صاف اور رواں اردو پر حیران تھا۔ دوسری طرف اس کا انگریزی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ تبلیغ کے ذکر پر ہیلن کا لہجہ عجیب سا ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا' میں نے کبھی تبلیغ نہیں کی' کر بھی نہیں سکتی۔ میں تو خود حق کی جستجو میں ہوں' میں کسی کو کیا روشنی دکھاؤں گی۔ آخر اس بات کا کیا مطلب تھا؟ کیا کہنا چاہتی تھی وہ؟ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ تنگ آ کر اس نے اس کے جلووں میں پناہ لی۔ پھر اچانک اس کے سامنے نمی آ کھڑی ہوئی۔ نمی جس کی معصومیت زبردستی کی آگہی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بھی اظہارِ محبت کیا تھا۔ وہ اس کی پیار بھری ڈانٹ سے بہت مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ صرف اسی کے ساتھ ایسا کر سکتی تھی' کیوں کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ ماجد جانتا تھا کہ نمی کا وعدہ مشروط ہے' اس کے التفات سے۔ اس کا التفات ہی نمی کو بچا سکتا تھا۔ علاقے کے ماحول سے بھی وہ بخوبی واقف تھا' اور یہ بھی جانتا تھا کہ پکے ہوئے پھل کے لئے بعض اوقات شاخ ہلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔

اسے تو ہوا کے ایک جھونکے کا بہانہ درکار ہوتا ہے اور ایسے میں وہ کسی بھی راہگیر کی جھولی میں جا گرتا ہے۔ یوں کسی اونچ نیچ کی صورت میں ماجد کا کچھ بگڑنا بھی نہیں تھا' لیکن طبعاً وہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ نمی ابھی بچی تھی۔ اسے برے بھلے کی تمیز نہیں تھی' دو چار سال بعد وہ ذہنی طور پر پختہ ہو جائے گی۔ اس دوران وہ اسے بے ضرر التفات کی مدد سے بہلا کر خوف ناک انجام سے بچا سکتا تھا۔ دن میں دو ایک بار نرمی کر لینے میں اس کا جاتا بھی کیا تھا۔ صرف اسی صورت میں وہ آگہی کی ترغیب سے بچ سکتی تھی۔ دو چار سال بعد نمی خود اس بارے میں سوچے گی تو اسے اپنی حماقت قرار دے کر اس پر ہنسے گی۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

اس کے خیالات کی رو پھر ہیلن کی طرف مڑ گئی۔ وہ آنے والی شامِ ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا اور خوشگواریت کا احساس لئے بالآخر سو گیا۔

☆======☆======☆

صبح وہ معمول کے مطابق دفتر کے لئے نکلا۔ اس روز بس میں آئینے کو تکتے ہوئے اس کے انداز میں ہمیشہ سے زیادہ بے تابی تھی' لیکن ہیلن نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کے اسے نہیں دیکھا۔ وہ زبان خامشی میں اسے پکارتا رہا۔ اس کی کوئی پکار ہیلن کی سماعت تک نہیں پہنچی یا شاید اس نے دانستہ اسے نظرانداز کر دیا۔ البتہ اپنے اسٹاپ پر اترتے وقت اس نے ایک بار اسے دیکھا اور پھر بس سے اتر گئی۔ اس کے اترنے کے بعد وہ مسلسل سوچتا رہا کہ آج ہیلن کی بے رخی اور بے نیازی کا کیا سبب تھا۔ انہی سوچوں میں گم وہ آفس پہنچا۔ کچھ دیر کام کیا......... لیکن اس روز کام میں دل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ پھر ہیلن کی بے رخی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی ناراضی تھی؟ ممکن ہے' کل کی کوئی بات اسے بری لگی ہو' لیکن اترتے وقت اس کا دیکھنا اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ پھر اس کی نگاہوں میں بھی خفگی نہیں بلکہ پیار تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ شاید پہلے کی بات اور تھی۔ تب ان کے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی لیکن کل کے بعد صورتِ حال بدل گئی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ صورتِ حال اس کے لئے کیوں نہیں بدلی۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو' بہرحال یہ حقیقت تھی کہ صورتِ حال ہیلن کے لئے بدلی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس نے اظہار کے ذریعے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔ وہ خود اب بھی آئینے

میں اس سے آنکھوں آنکھوں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ بات جو وہ کل موقع ملنے کے باوجود زبان سے نہیں کہہ سکا تھا۔ ہاں' شاید یہی بات تھی۔

وہ شام کے انتظار میں شام کے بارے میں سوچتا اور خواب دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی انسان کو تعبیر کے انتظار میں تعبیر کے خواب بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔ اس کا اندازہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اس روز اس نے اپنے کسی ساتھی سے بات کی نہ کوئی شرارت۔ حالاں کہ وہ آفس میں شرارتی اور چلبلا مشہور تھا۔ دو ایک ساتھیوں نے اسے چھیڑنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو انھوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ٹھیک پانچ بجے وہ دفتر سے نکلا' بس پکڑی اور اوڈین کے اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہاں اتر کر وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے پانچ بجے تھے۔ گویا ہیلن کی آمد میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اب وہ خوف محسوس کرنے لگا۔ اس نے ہیلن کو مدعو تو کر لیا تھا لیکن یہ اس کے لئے پہلا موقع تھا' کسی لڑکی کو کسی ریسٹورنٹ میں لے جانے کا۔ یوں کیفے اوڈین اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ عموماً اپنے دوستوں اور آفس کے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آتا رہتا تھا۔ اوپر فیملی کیبن تھے۔ اس کے لئے دروازہ الگ تھا۔ سامنے ہی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ اوپر جا کر فیملی کیبنز کا جائزہ لے لیکن اسے ڈر تھا کہ کوئی ویٹر اسے روک دے گا۔ یہ کہہ کر کہ اوپر صرف فیملی والے جا سکتے ہیں۔

ہیلن مقررہ وقت سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گئی۔ وہ اوڈین ہی کے اسٹاپ پر چھ نمبر بس سے اتری تھی۔ ماجد کو حیرت ہوئی کہ وہ ۲۱ نمبر سے نہیں آئی ہے۔

"ہیلو۔" ہیلن نے بے حد شگفتگی سے کہا۔ "کیسے ہو ماجد؟" اس کے انداز میں ایسی بے تکلفی تھی' جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔

ماجد نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی شناسا اسے ہیلن کے ساتھ دیکھ لے گا۔

ہیلن نے بھی یہ بات بھانپ لی۔ "ڈر رہے ہو' ہے نا؟ واپس چلی جاؤں میں؟"

"نہیں' یہ بات نہیں۔ میں تو بس یونہی۔" ماجد نے جھینپ کر کہا۔ "آیئے چلیں۔"

وہ کیفے اوڈین کی اوپری منزل پر پہنچے۔ وہاں علیحدہ کیبن بھی تھے' جن پر پردے لہرا

رہے تھے۔ اس کے علاوہ باہر بھی میزیں لگی تھیں۔ پوری منزل سنسان پڑی تھی۔ ماجد نے باہر والی میزوں کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ہیلن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یہاں نہیں' ہم اندر بیٹھیں گے۔" اس نے اسے ایک کیبن کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ماجد نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ کیبن میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "آدمی کو پرائیویسی کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے.......... اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی۔" ہیلن نے کہا۔

ماجد کہنا چاہتا تھا کہ پرائیویسی کی حدود گھر سے شروع ہو کر گھر پر ہی ختم ہو جاتی ہیں' لیکن چاہنے کے باوجود وہ یہ بات نہ کہہ سکا۔ "آپ اس راستے سے.........."

"میرا خیال ہے' اب ہمیں یہ آپ جناب کا تکلف بر طرف کر دینا چاہئے۔" ہیلن نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جی' جی ہاں۔ میں یہ پوچھ رہا تھا کہ تم اکیس نمبر کے بجائے چھ نمبر بس میں کیسے آئیں؟" ماجد نے پوچھا۔ اسے ہیلن کو تم کہہ کر مخاطب کرنا عجیب بھی لگا تھا اور اچھا بھی۔

"اکیس نمبر دیر سے پہنچاتی اور وہ بھی ایمپریس مارکیٹ۔ وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں' میں لیٹ بھی ہو سکتی تھی۔ اسی لئے میں آفس سے میکلوڈ روڈ وہاں سے بولٹن مارکیٹ کی طرف نکل آئی۔"

ماجد کو افسوس ہوا کہ اس نے ملاقات کا وقت طے کرتے ہوئے اس سے یہ تک نہیں پوچھا تھا کہ اس کی چھٹی کس وقت ہوتی ہے۔ یہ اس کی خود غرضی کا ثبوت تھا۔ "تو تم مجھے بتا دیتیں' ہم بعد کا کوئی وقت رکھ لیتے۔" اس نے کہا۔

"جب کہ میں تم سے کہہ چکی تھی کہ جس وقت اور جہاں کہو گے' مل جاؤں گی۔ اس کے بعد کسی بات کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔" اس نے ماجد کو یاد دلایا۔

"اوہ' تو اتنا پاس ہے اپنے لفظوں کا؟"

"اس سے بھی زیادہ۔ کبھی آزما لینا۔ میں نہ کبھی جھوٹ بولتی ہوں اور نہ مصلحت سے کام لیتی ہوں۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

اسی وقت ویٹر آ گیا۔ "کیا پیو گی؟" ماجد نے اس سے پوچھا۔

"جو جی چاہے' منگوا لو۔"

ماجد نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا.......... اور ہیلن کو بغور دیکھنے لگا۔ ہیلن کو اس کی

نگاہوں کا احساس تھا لیکن وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

”اپنی خوش قسمتی کا ثبوت دیکھ رہا ہوں۔“

”خوش قسمتی کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی ماجد!“

اس کے لہجے میں حجاب تھا۔ ماجد نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔ وہ عجیب لڑکی تھی‘ تضادات سے عبارت‘ نہایت سادگی سے گہری بات کہہ جاتی تھی۔ اس وقت اس نے کتنی سادگی سے‘ بغیر کہے اس کے وجود کو اپنی خوش قسمتی کا ثبوت کہہ دیا تھا۔ ایک طرف تو وہ اتنی بولڈ تھی کہ اس نے بغیر ہچکچائے پہلی ہی گفتگو میں اظہارِ محبت کردیا تھا۔ دوسری طرف یہ اشارے کنائے کا انداز‘ یہ حجاب۔ ماجد اسے دیکھتا رہا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہ تازگی نہیں تھی‘ جو صبح نظر آتی تھی۔ پھر ہیلن نے نظریں اٹھائیں۔ ماجد کو اس کی آنکھوں میں تھکن اور اضمحلال کا تاثر نظر آیا۔

”تم کام کیا کرتی ہو ہیلن؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم میں اسٹینو ہوں۔ دن بھر شارٹ ہینڈ اور ٹائپ۔ آج کام بھی زیادہ ہی تھا۔“ اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھی۔

”تم کہاں سروس کرتے ہو؟“

”میں کے پی ٹی میں ہوں۔“

”سرکاری ملازمت؟ تب تو مزے ہوں گے تمہارے۔“

”ہاں۔ یہ تو ہے لیکن تنخواہ کم ہے۔“

ویٹر چائے لے آیا۔ ہیلن نے چائے بنائی اور پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ ”اب بتاؤ‘ مجھے کیوں بلایا ہے۔“ اس نے کہا۔ پھر خود ہی صفائی پیش کی۔ ”اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے صرف اسی صورت میں بلا سکتے ہو‘ جب کوئی بات ہو۔ یہ بات نہیں ہے۔ تم جب اور جہاں بلاؤ گے‘ میں ضرور پہنچوں گی۔“

”کچھ نہیں‘ بس تمہیں قریب سے دیکھنا‘ سمجھنا چاہتا ہوں میں۔“ ماجد نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں سگریٹ جلا لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”یہ بات تم نے پہلے کبھی سوچی؟ تم میرے عین پیچھے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے ہو۔“

”تب کی بات اور تھی۔“

”یہاں مجھے تم سے اختلاف ہے۔ محبت کا انحصار اظہار پر تو نہیں ہوتا۔ میں تو شروع ہی سے تمہارے بارے میں اپنائیت سے سوچتی رہی ہوں۔“

ماجد جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ دوسری ہی ملاقات تھی لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کی سچائی اسے آئندہ بھی شرمندہ کرتی رہے گی۔

”تم عجیب لڑکی ہو۔“ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ”ویسے تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”یہ لہجہ تم پر بہت اچھا لگتا ہے‘ بہت سوٹ کرتا ہے تمہیں۔“ ہیلن نے آنکھیں موندتے ہوئے‘ خواب ناک لہجے میں کہا۔ ”کاش‘ تم مجھ سے ہمیشہ اسی لہجے میں گفتگو کرتے رہو اور سنو‘ پہلے مجھے سگریٹ کا دھواں بہت برا لگتا تھا‘ لیکن جب سے تم ملے ہو‘ یہ بات نہیں رہی‘ بلکہ تمہارے سگریٹ کا دھواں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔“

اس کی نگاہوں میں‘ اس کی باتوں میں‘ لہجے میں‘ ہر انداز میں ایسی محبت تھی کہ ماجد سرشار ہو کر رہ گیا۔ اس نے بڑی ممنونیت سے ہیلن کو دیکھا اور سگریٹ سلگایا۔

”ہاں‘ تو تم میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔ ایسا کرو پہلے تم سوال پوچھو۔ جب تمہارے پاس سوال ختم ہو جائیں گے تو میں تمہیں خود اپنے بارے میں بتاؤں گی۔ سب کچھ بتاؤں گی‘ کچھ نہیں چھپاؤں گی‘ سوائے ایک بہت بڑے سچ کے‘ جو مجھ پر میری روح کا قرض ہے۔“

”تم رہتی کہاں ہو؟“

”اس کا جواب میں عملاً دوں گی۔ آج میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں گی‘ اپنی مما اور پاپا سے ملاؤں گی تمہیں۔“

”تم اتنی اچھی اردو کیسے بولتی ہو؟“

”اردو ہی کیا‘ میں تو.........“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ”دراصل مجھے ابتدا ہی سے ادب سے لگاؤ رہا ہے۔ پھر میری اردو کی ٹیچر بھی مجھ پر بہت توجہ دیتی تھیں۔ اردو ادب میں نے گھول کر پی ڈالا ہے‘ تلفظ کے سلسلے میں میری ٹیچر نے میری رہنمائی کی۔ وہ تو شکر کرو‘ میں نے تمہیں اب تک شعر نہیں سنائے۔ فراز اور ناصر کے سینکڑوں شعر یاد ہیں

مجھے۔" اس کے لہجے میں انکسار ہی انکسار تھا۔ "انگریزی ناول بھی بہت پڑھے ہیں میں نے' لیکن وہاں تخصیص نہیں ہے کوئی۔ بس' جو ناول مل گیا' پڑھ ڈالا۔ اگر مجھے موقع ملا ہوتا تو شاید میں بھی لکھتی۔ شروع ہی سے میرا رجحان لکھنے کی طرف تھا۔" اس کا لہجہ اداس ہو گیا۔

"مجھ سے.......... مجھ سے تعلق کا احساس تمہیں کب ہوا؟"

"اس سوال کا جواب پہلے تم دو گے؟"

"مجھے تم پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھیں۔ تمہارے آنچل کا وہ پہلا لمس' اس سے پہلے کسی لمس نے مجھے اس طرح نہیں جھنجھوڑا تھا۔ پھر میں نے آئینے میں تمہارا عکس دیکھا اور بس۔ مجھے پتا چل گیا کہ میں خود کو ہار گیا ہوں۔ میں ہمیشہ پہلی نظر کی محبت کا مذاق اڑاتا تھا۔ شاید اسی لئے کہ مجھے خود اس کا شکار ہونا تھا۔" ماجد نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

اب اس کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔ "اب تم بتاؤ۔" اس نے کہا۔

"مجھے تم سے تعلق کا پہلا احساس اس وقت ہوا تھا' جب میں نے ہوش سنبھالا تھا۔" ہیلن نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "اس وقت تم' تم نہیں تھے' بلکہ یوں کہو کہ تمہارا کوئی نام نہیں تھا۔ اس روز بس میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میرا آنچل پیچھے جا گرا ہے۔ میں نے آئینے میں تمہیں دیکھا۔ تم اس وقت آئینے کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ میں تمہارے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی۔ تمہیں اچھا لگا تھا لیکن تم ڈر رہے تھے۔ تم بظاہر دوسری طرف متوجہ ہو گئے' لیکن کن انکھیوں سے میرے آنچل کو دیکھتے رہے۔ بس اسی لمحے میں تمہیں پہچان گئی کہ تم وہی ہو جس کی میں برسوں سے آرزو کرتی رہی ہوں.........."

"لیکن تم نے مجھ میں کیا دیکھا؟ میں کیوں بھایا تمہیں؟" ماجد نے پوچھا۔

"ٹوکو مت' میں یہی بتانے والی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ماحول میں کتنی آزادی ہے' لیکن نہ جانے کیوں' میں شروع ہی سے مختلف ہوں۔ میں نے اس آزادی کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا۔ میں نے خود اپنے آپ پر پابندیاں لگائیں۔ ہمارے ہاں محبت کھیل ہے لیکن میں شروع ہی سے محبت کا کچھ اور تصور رکھتی ہوں۔ مجھے اب تک بیسیوں مردوں کے اظہارِ محبت سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ کبھی اچھا نہیں لگا۔

یوں میرے ذہن میں تمہارا تصور جمتا گیا۔ اس روز میں نے تمہیں گھبراتے دیکھا اور تمہیں پہچان گئی۔ پھر تم نے آئینے میں مجھے دیکھا۔ تم نظریں چرا رہے تھے' چپکے چپکے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس روز صحیح معنوں میں پہلی بار مجھے پتا چلا کہ محبت کتنا حسین جذبہ ہے لیکن ساتھ ساتھ ہی میں بھی ڈرنے لگی کہ تمہیں میرے کرسچن ہونے کا پتا چلے گا تو تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔"

ماجد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت انگیز لڑکی تھی' اس کی باتیں اور اس کی محبت بھی حیرت انگیز تھی۔

"اب تھوڑی دیر بعد میں تمہیں اپنے گھر لے کر چلوں گی۔" ہیلن نے مزید کہا۔ "اس لئے بہتر ہے کہ اپنے لواحقین کے متعلق بتا دوں۔ مما بہت اچھی ہیں۔ مہربان اور محبت کرنے والی۔ پاپا بہت اچھے تھے' اب ذرا چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ میرے علاوہ دو بہنیں ہیں۔ مَیری مجھ سے بڑی ہے۔ وہ بھی سروس کرتی ہے۔ شیلا مجھ سے چھوٹی ہے اور کالج میں پڑھ رہی ہے۔ پاپا کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے میں اور مَیری کالج نہیں جا سکے۔ ہم چاہتی ہیں کہ شیلا کو یہ محرومی نہ ملے۔ میرے پاپا بہت شراب پیتے ہیں لیکن وہ کیا کریں۔ وہ بہت زندہ دل آدمی تھے' بے حد فعال۔ حادثے میں ان کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ اب وہ بستر تک محدود ہیں۔ سوائے پینے کے اور کیا کر سکتے ہیں؟"

بیرا بل رکھ گیا۔ ماجد نے دس کا نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا۔

"میرا جی چاہ رہا تھا بل دینے کو' لیکن میں جانتی ہوں کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگے گا۔ ویسے بھی میرا دل تو نہ جانے کیا کیا چاہتا ہے۔"

"تم مجھے گھر پر چائے پلا دینا۔ اب چلیں؟"

ہیلن نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ اٹھے اور باہر نکل آئے۔

☆======☆======☆

وہ ماجد کے لئے ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ صدر کا علاقہ اس کا دیکھا بھالا ہے لیکن آج وہ جس صدر کو دیکھ رہا تھا' وہ اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ گلیوں میں قدیم عمارتیں تھیں' جن میں سے بہت سی تو خطرناک حد تک بوسیدہ تھیں۔ گلیوں میں متعدد جوڑے ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ کوئی کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کبھی کوئی سر اٹھا کر دیکھتا اور ہائے ہیلن......... ہیلو ہیلن کہتا اور پھر مصروف ہو جاتا۔ گلی سے گزر کر وہ مین روڈ پر پہنچتے اور اسے کراس کر کے دوسری گلی میں پہنچ جاتے۔ تمام گلیاں' ان میں ایستادہ عمارتیں اور وہاں کا ماحول' سب کچھ ایک جیسا تھا۔ انہیں علیحدہ سے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر انہوں نے مینس فیلڈ اسٹریٹ کراس کی اور ایک گلی میں داخل ہوئے۔ گلی میں چند لڑکے کھڑے تھے۔ آدھی آستین والی بشرٹیں اور جینز پہنے۔ ان میں ایک لڑکا ہیلن کو دیکھ کر آگے بڑھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے' بڑی بڑی قلمیں اور گھنی مونچھیں تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں اسٹیل کا کڑا تھا۔ گریبان کھلا ہوا تھا اور گلے میں پڑی ہوئی پتلی سی زنجیر نظر آ رہی تھی۔

"ہائے ہیلن!" اس نے بے حد تپاک سے کہا۔ "آج تم دیر سے آئی ہو۔ یہ ساتھ میں کون ہے؟"

"ہی از مائی فرینڈ۔" ہیلن نے خشک لہجے میں کہا اور ماجد کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ دونوں آگے بڑھ گئے تھے۔

"تو تم کو دوستی کرنا آ گیا ہیلن!" لڑکا عقب سے چیخا۔ "قسم توڑنا تھا تو ہم سے کہتیں' ہم حاضر........."

"اوہ شٹ اپ ولسن!" ہیلن نے پلٹ کر دیکھے بغیر سخت لہجے میں کہا۔ "مائنڈ یور اون بزنس۔"

ہیلن کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ دروازے کے عین اوپر ایک چھوٹی سی صلیب گڑی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر چلے گئے۔ فلیٹ میں دو کمرے تھے۔ پہلا بطور سٹنگ روم استعمال ہوتا تھا۔ ہیلن' ماجد کو اسی کمرے میں لے گئی۔ آہٹ سن کر ایک عورت کچن سے نمودار ہوئی۔ وہ ایپرن باندھے ہوئے تھی۔ اس کی عمر پچاس سے کم نہیں تھی۔ "گڈ ایوننگ مما!" ہیلن نے اسے مخاطب کیا۔

"گڈ ایوننگ مائی ڈارلنگ!" عورت نے کہا اور سوالیہ نظروں سے ماجد کو دیکھا۔

"ہی از مائی فرینڈ مما! ماجد رشید۔ میں اسے آپ سے ملوانے لائی ہوں۔ ماجد! یہ ہیں میری سویٹ مما۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" ماجد نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"ہم کو بھی خوشی ہوا ماجد۔" مما نے کہا۔ "بی لیو می۔ یو آر آنرڈ مائی بوائے۔ یو آر دی فرسٹ بوائے فرینڈ شی ہیز میڈ۔" اس کے لہجے میں محبت کے ساتھ ہلکی سی تلخی بھی تھی۔

"او مما!" ہیلن نے احتجاج کیا۔ پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔ "میری کہاں ہے......... شیلا کہاں ہے؟"

"میری جارج کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ شیلا تمارا پاپا کے کمرے میں پڑ رہا ہے۔"

"آؤ ماجد! تمہیں پاپا اور شیلا سے ملاؤں۔" ہیلن نے ماجد کا ہاتھ تھاما اور دوسرے کمرے کی طرف چل دی۔ ماجد نروس ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

ہیلن کا باپ کم از کم دیکھنے میں تو بہت بوڑھا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سارے بال سفید تھے۔ چہرے پر لکیروں کا جال تھا اور بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی سرخی تھی۔ بڑھے ہوئے شیو کی وجہ سے وہ خاصا خوف ناک معلوم رہا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا تھا' دیوار سے ٹیک لگائے۔ اس کی ٹانگوں پر گھٹنوں تک کمبل پڑا ہوا تھا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک رائٹنگ ٹیبل پر ٹیبل لیمپ روشن تھا اور ایک لڑکی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں کے کمرے میں داخل ہونے پر وہ دونوں چونکے۔

"گڈ ایوننگ پاپا! ایوننگ شیلا!" ہیلن نے چہک کر کہا اور انہیں جواب دینے کا موقع دیئے بغیر ماجد سے ان کا تعارف کرا ڈالا۔

بڈھے نے بڑی بے دلی سے ماجد سے ہاتھ ملایا۔ اس کی سانسوں سے شراب کی بو رہی تھی۔ ماجد کا جی متلانے لگا۔ اس نے بڈھے سے کچھ رسمی گفتگو کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ لڑکی اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے بڑی دلچسپی سے ماجد کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ہیلن سے کہا۔ "چلو' سٹنگ روم میں چلتے ہیں۔"

ماجد کی سمجھ میں اس کی وجہ بھی آ گئی۔ ہیلن کے پاپا نے سائیڈ ٹیبل سے جام اٹھالیا تھا۔ وہ تینوں کمرے سے نکل آئے۔ ہیلن کی مما وہیں رہ گئی تھیں۔ سٹنگ روم میں ہیلن نے ماجد کو صوفے پر بٹھایا۔ شیلا کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ "میں ابھی آتی ہوں' جب تک تم شیلا سے باتیں کرو۔" ہیلن نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

ماجد اور شیلا نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا۔ شیلا بڑی نرم و نازک سی لڑکی تھی۔ عمر سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شیلا کی نگاہوں میں ماجد کے لئے پسندیدگی تھی۔ "آپ اچھے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ بہت اچھے ہوں گے' بہت زیادہ اچھے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" ماجد نے کہا۔ "ویسے تم بھی مجھے بہت اچھی لگی ہو۔"

"آپ سے ہیلن نے دوستی کی ہے تو یقیناً آپ بہت اچھے ہوں گے۔" شیلا نے جواب دیا۔ "سے بی یو ڈونٹ نو' بٹ شی ہیز اے ویری ڈیفکلٹ اینڈ ان ارتھلی اسٹینڈرڈ آف ججنگ دی مین۔"

ماجد جھینپ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"بہت سے لڑکوں نے ہیلن سے دوستی کرنے کی کوشش کی لیکن ہیلن نے کبھی کسی کو قبول نہیں کیا۔ آپ پہلے آدمی ہیں اور سنیں' ہیلن بہت اچھی ہے' بہت ہی اچھی۔" کہتے ہوئے شیلا نے آنکھیں میچ لیں۔ اس لمحے وہ ماجد کو بہت کم سن' بہت پیاری لگی۔

"یہ میں اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ وہ میری بہن ہے۔ وہ سچ مچ بہت اچھی ہے۔ ہم سب اس کے لئے دعا کرتے ہیں.......... اسے خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک بات کہوں۔ مجھے آپ سے مل کر سچ مچ بہت خوشی ہوئی۔"

ماجد کا سینہ اس لڑکی کے سچے جذبے سے بھر سا گیا لیکن ایک بات اسے عجیب سی

لگی رہی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ وہ مسلمان ہے' پھر بھی اس کی پذیرائی کر رہے تھے' ہیلن کی پسندیدگی کے حوالے سے۔ آزاد خیالی اپنی جگہ لیکن ایسے معاملات میں تو سبھی لوگ تنگ نظر ہو جاتے ہیں۔ "تم سب لوگ مجھے اچھے لگے ہو۔" اس نے کہا۔ "اور ہیلن تو واقعی بہت ہی اچھی ہے۔"

اسی وقت ہیلن چائے کا مگ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے مگ ماجد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

"یہ کیا!" ماجد نے حیرت سے پوچھا۔

"چائے' جس کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ میں خود بنا کر لائی ہوں۔ مما کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا میں نے۔"

"لیکن.........."

"ہیلن وعدہ ہمیشہ اور ہر حال میں پورا کرتی ہے۔" شیلا نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ تینوں باتیں کرتے رہے۔ ماجد چائے ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب نے اسے بڑی گرم جوشی سے الوداع کہا تھا۔ اس بار پاپا نے بھی اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا' البتہ ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ مما نے بڑی محبت سے اسے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔ ہیلن اور شیلا اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھیں۔

گلی میں وہ تھوڑی دور ہی چلا ہو گا کہ کسی نے اسے پکارا۔ "اے مسٹر!" اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ولسن تھا جو دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور سلگتا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ ماجد رک گیا۔

"نام کیا اے تمہارا؟"

"ماجد۔"

"ویل مسٹر ماجد! کیپ اٹ ان مائنڈ دیٹ ہیلن از مائی گرل۔"

"دین گو اینڈ ٹیل ہر۔ آئی ایم ناٹ ہیلن۔"

ولسن نے بہت زور کا قہقہہ لگایا۔ "کھوب.......... تم کھش مزاج آدمی ہے' لیکن تم اپن کو نئیں جانتا۔ اپن ایسا جواب دینے والے کا دانت حلک میں اتار دیتا ہے۔"

"میں تمہیں جاننا بھی نہیں چاہتا۔" ماجد نے بے حد رسان سے کہا۔ "لیکن تم بھی

مجھے نہیں جانتے ہو۔ میرے والد یہاں فائیو فائیو پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر ہیں' انسپکٹر رشید نام ہے ان کا۔" ماجد نے پولیس اسٹیشن کی سمت اشارہ کیا۔ "اور جو کام تم نے بتایا ہے' میرے والد اس میں اسپیشلسٹ ہیں۔ وہ آدمی کی کھال بھی اتنی صفائی سے اتارتے ہیں کہ اس کے ساتھ گوشت کا ایک ذرہ بھی نہیں آتا۔"

"تم سمجھے گا ہم ڈر گیا۔" ولسن نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن یہ بات نہیں ہے۔ ہم کسی سے نئیں ڈرتا۔ پر ہم جانتا ہے کہ گلطی تمارا نئیں ہے۔ وہ اپنا ہیلن ہی کالا بھیڑ ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی۔ "پر تم یہ تو سوچو' تمارا اس کا ریلیجن الگ اے.........."

"تم اس کی فکر مت کرو یہ میرا دردِ سر ہے۔" ماجد نے سرد لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"ایک بات مائنڈ میں رکھنا۔ کوئی اونچ نیچ ہوا تو یہ نہ سمجھنا کہ ہیلن کا کوئی آگے پیچھے نئیں اے۔ کھدا کسم' اپن کسی سی آئی ڈی انسپکٹر سے نئیں ڈرتا۔" ولسن نے چیخ کر کہا۔

ماجد خاموشی سے بڑھتا رہا۔ اس کے ذہن میں اس وقت صرف ہیلن کا خیال تھا۔

☆======☆======☆

اس دن کے بعد ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ماجد کئی بار ہیلن کے گھر گیا۔ بس کے تعلق کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ ہیلن کے گھر کئی بار جانے کے بعد یہ ہوا کہ وہ اس کے پاپا کو پسند کرنے لگا۔ حالاں کہ ان کے بارے میں اس کا پہلا تاثر اچھا نہیں تھا' لیکن قریب سے دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ بوڑھا البرٹ درحقیقت بہت نفیس اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ وہ صرف معذوری کی محرومی ہی سے دوچار نہیں تھا بلکہ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ بیوی عموماً گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔ بچیاں سروس اور تعلیم کے سلسلے میں مصروف رہتیں۔ اسے کوئی بھی وقت نہیں دے پاتا تھا۔ مطالعے سے اسے شغف نہیں تھا۔ ایسے میں آدمی پینے کے سوا کیا کرے۔ پھر پیتے ہوئے اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ بچیوں پر بوجھ ہے۔ ماجد نے اسے ذرا سا وقت دیا تو وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ ماجد سے دنیا جہان کی باتیں کرتا.......... اسے اپنے تجربات سناتا۔ درحقیقت وہ اندر سے بہت بھرا ہوا

آدمی تھا۔ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ماجد کو اس کی قربت میں بہت لطف آتا۔ ہیلن کبھی کبھی اس بات پر احتجاج کرتی کہ ماجد آتا ہے تو پاپا ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن اندر ہی اندر اس بات پر خوش ہوتی اور ماجد کے لئے ممنونیت محسوس کرتی۔

"ہی از اے ویری نائس بوائے۔" بوڑھا البرٹ خوش ہو کر کہتا۔ "کاش.......... کاش.........." لیکن اس کا جملہ کبھی پورا نہ ہوتا۔

ہیلن کی مما بھی ماجد سے بہت پیار کرتیں' اور شیلا تو اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ شاید بھائی سے محرومی کے بعد ماجد کا وجود اسے کسی سایہ دار درخت کی مانند محسوس ہوتا تھا۔ ماجد بھی بڑے بھائی ہی کی طرح اس کے ناز اٹھاتا۔ وہ اس گھر کا فرد بن گیا تھا۔

ایک دن وہ دفتر سے گھر لوٹا تو امی کا منہ پھولا ہوا تھا۔ پہلے تو انہوں نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ پھر اچانک بولیں۔ "یہ تم نے لڑکیوں سے دوستی کا سلسلہ کب سے شروع کر دیا ہے؟"

ماجد بری طرح گڑبڑا گیا۔ "کیا.......... کیا مطلب؟"

"ایک لڑکی آئی تھی آج۔ کہتی تھی' میں ماجد کی دوست ہوں۔"

"میری دوست!"

"ہاں.......... ہیلن نام تھا اس کا۔"

"اوہ ہیلن۔" اس نے گہری سانس لی اور جلدی سے بات بنائی۔ "وہ بہت اچھی لڑکی ہے امی! دفتری کام کے سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھی تو ہے وہ۔" امی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن عیسائی ہے۔"

"صرف اچھی نہیں' وہ بہت اچھی ہیں۔" ثمینہ نے مداخلت کی۔

"میرا تو جی چاہتا تھا کہ انہیں واپس ہی نہ جانے دوں۔" زرینہ بولی۔

"تو ٹھیک ہے' نہ جانے دیتیں اسے۔" ماجد نے بہنوں کی حمایت کا فائدہ اٹھایا۔

"چلو تم دونوں یہاں سے۔" امی نے ثمینہ اور زرینہ کو ڈانٹا۔ "ہر بات میں ٹانگ مت اڑایا کرو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں امی! وہ اتنی اچھی ہیں کہ.........." زرینہ نے ماں کے تیور دیکھے تو ثمینہ کے ساتھ وہاں سے کھسک لی۔

"اب تم بتاؤ' یہ کیا سلسلہ ہے؟" امی نے ماجد سے پوچھا۔

"آپ خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔ بات تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

امی چند لمحے اسے بغور دیکھتی رہیں۔ وہ پوری طرح مطمئن معلوم نہیں ہو رہی تھیں۔ تاہم بات آئی گئی ہو گئی۔

ہیلن' ماجد سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ وہ اس کی امی اور بہنوں سے ملنا چاہتی ہے۔ ماجد ڈرتا تھا۔ اس پر ہیلن نے کہا تھا کہ وہ انہیں یہ بتائے گی کہ کام کے سلسلے میں وہ ماجد سے ملی تھی۔ وہ برسوں سے کسی مسلمان فیملی کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی' اس لئے چلی آئی ہے۔ اس لئے ہیلن کے تذکرے پر ماجد کو یہ بات سوجھ گئی اور شاید ہیلن نے امی سے یہی کہا تھا' ورنہ وہ کبھی مطمئن نہ ہوتیں۔

اگلے روز وہ دونوں پھر کیفے اوڈین میں ملے۔ "تم نے تو کل مجھے مروا ہی دیا تھا۔" ماجد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"کیوں.......... کیا ہوا؟"

"امی نے مجھے گھیر لیا تھا تمہارے بارے میں۔ وہ تو شکر ہے کہ مجھے تمہاری بات بروقت یاد آ گئی' دفتری کام کے سلسلے میں ملاقات والی۔"

ہیلن کھلکھلا کر ہنس دی' لیکن فوراً ہی سنجیدہ بھی ہو گئی۔ "مجو! کل مجھے تمہاری وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا' لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"میری وجہ سے کیوں؟" ماجد نے پوچھا۔

"یہ تم ڈرتے جو ہو۔ تم تو ہمیشہ منع کر دیتے تھے مجھے اپنے گھر جانے سے۔"

"امی تو اس پر بھی خاصی برہم تھیں اور پھر تمہارا مطلب کیا ہے؟ کیا تم امی کو اپنی لو اسٹوری سناتیں؟" ماجد نے آنکھیں نکالیں۔

ہیلن کو پھر ہنسی آ گئی۔ "نہیں' یہ ممکن نہیں تھا لیکن بہرحال میں جھوٹ نہیں بولتی اور یہ بھی جانتی ہوں کہ سچ لفظوں کے بغیر بھی بولا جا سکتا ہے۔"

"ہاں بھئی' اس معاملے میں تو تم بہت تیز ہو۔" ماجد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ویسے تم نے یہ جھوٹ میرے لئے نہیں' اپنے لئے بولا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ اس طرح ان پر تمہارا اچھا تاثر نہیں پڑتا اور ان دی لانگ رن یہ بات نقصان دہ ثابت ہوتی۔"

"یہ بات ہے تو میں کل ہی جا کر تمہاری امی کو حقیقت بتا دیتی ہوں۔ جھوٹ ویسے بھی ہمیشہ ذلیل کراتا ہے۔"

"ارے نا نا.......... 'ایسا غضب نہ کرنا۔ پلیز.......... میری خاطر۔"

"تمہاری خاطر جھوٹ بولتی ہوں تو تم اسے خود غرضی سمجھتے ہو میری۔" ہیلن کے لہجے میں شکایت تھی۔

"غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔" ماجد نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم میرے گھر کیوں جانا چاہتی تھیں؟"

"جانا چاہتی تھی نہیں' جانا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ کے لئے اور اس سے پہلے بھی کئی بار تاکہ ایڈجسٹمنٹ دشوار نہ ہو۔ کیا وہ میرا گھر نہیں ہے؟"

"بالکل ہے۔" ماجد نے کہا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا' جہاں اس وقت خواب ہی خواب تھے' جیسے وہ کسی تصور میں کھو گئی ہو۔ "ایڈجسٹمنٹ میں تمہیں کیا دشواری ہو گی۔" ماجد نے مزید کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ کوئی آسان بات ہے؟"

"اور کیا' ثمینہ اور زرینہ تو تم پر فدا ہو گئی ہیں اور امی نے بھی تمہیں ناپسند نہیں کیا ہے۔"

ثمینہ' زرینہ کے ذکر پر ہیلن کی آنکھیں چمک اٹھیں لیکن وہ چمک فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ "پھر بھی مجو! دشواری تو ہوتی ہی ہے' ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔ میں تو پھر غیر مذہب کی ہوں تم لوگوں کے لئے۔"

"ارے چھوڑو نا' یہ کیا باتیں لے بیٹھیں تم۔"

"یہ بات ضروری ہے۔ میں وقتاً فوقتاً تمہارے گھر جاتی رہوں گی لیکن تمہاری عدم موجودگی میں۔ میں تمہارے گھر کے ہر فرد کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ کس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہیں میری وجہ سے شرمندگی ہو۔" ہیلن نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں تمہاری وجہ سے کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتا۔"

"ایسی باتیں نہ کرو مجو! تم بہت غیر عملی آدمی ہو۔"

ماجد کھسیا کر رہ گیا۔

ہیلن نے جو کہا تھا' وہی کیا۔ وہ اس کے بعد بھی کئی بار ماجد کے گھر گئی۔ حالاں کہ اس کے لئے اسے آفس سے چھٹی کرنی پڑی تھی۔ وہ ماجد کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کا نتیجہ بہرحال مثبت نکلا۔ اب تو شاہد بھی اس کے گن گاتا تھا۔ البتہ امی کے رویے میں اب بھی کھنچاؤ تھا۔ ثمینہ نے تو ایک بار ماجد کے کان میں کہہ بھی دیا تھا کہ اگر ہیلن مسلمان ہو جائے تو اس سے اچھی بھابی دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔ یوں ماجد کے ذہن میں پہلی بار یہ بات آئی تھی۔

ایک شام ماجد کو کلفٹن کی سوجھی۔

"ٹھیک ہے۔ مزہ آ جائے گا۔" ہیلن نے خوشی سے کہا۔ "ہم تانگے پر چلیں گے۔"

"تانگے پر!" ماجد کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں نا' آؤ میرے ساتھ۔" ہیلن بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہو گئی۔

ماجد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت کیفے اوڈین سے نکلے تھے۔ ہیلن اس کا ہاتھ تھام کر تیز قدموں سے چلتی رہی۔ اس کا رخ صدر دواخانے والے تانگا سٹینڈ کی طرف تھا۔ "کیا پتا' رمضانی بابا سواریاں لے کر گئے ہوئے ہوں۔" ہیلن خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "خیر' ہم انتظار کر لیں گے۔"

ماجد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ہیلن نے چہک کر کہا۔ "وہ رہے' رمضانی بابا موجود ہیں۔" اس نے ایک بڈھے تانگے والے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

تانگے والا ہیلن کو دیکھتے ہی نیچے اتر آیا۔ "آؤ بیٹا۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔ "کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں بابا!" ہیلن نے کہا اور جھٹ ماجد کا تعارف کرا دیا۔ "یہ ماجد ہے بابا میرا.........." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور جلدی سے بولی۔ "بابا! تمہارا تانگا چاہیے ادھار۔"

"ضرور بیٹا! ادھار کیسا۔ یہ تو ہے ہی تمہارا۔ کہاں چلو گی؟"

"نہیں بابا!" ہیلن نے ٹھنک کر کہا۔ "تانگا میں چلاؤں گی۔ بس ہم دونوں ہوں گے اس میں۔ پھر یہیں واپس دے جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بیٹا!"

ماجد' بڈھے رمضانی کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ یہ تعلق اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ہیلن سے کہا۔ "یہ چھت والا تانگا تو بہت برا لگے گا۔"

ہیلن نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر بڈھے رمضانی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی نظروں میں سوال بھی تھا اور التجا بھی۔

"ارے' یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ابھی چھت کھول دیتا ہوں اس کی۔" رمضانی نے کہا' اور واقعی دیکھتے ہی دیکھتے تانگے کی چھت کھول دی۔

ہیلن اچھل کر کوچبان کی نشست پر بیٹھ گئی۔ "آؤ مجو! میرے ساتھ بیٹھو۔" وہ چہکی۔ "پیچھے نہیں بیٹھنے دوں گی تمہیں ورنہ میری پوزیشن خراب ہوگی۔ لوگ کوچبان سمجھنے لگیں گے مجھے۔"

ماجد کو ہنسی آ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پُرتشویش لہجے میں ہیلن سے پوچھا۔ "تم چلا لو گی تانگا؟"

"ارے بیٹا! ساری عمر چلاتی رہی ہے ہمارا تانگا' تم بالکل فکر نہ کرو۔" ہیلن کے بجائے رمضانی نے جواب دیا۔ ماجد نے ہیلن کو غور سے دیکھا۔ ہیلن نے فخریہ انداز میں سر ہلا دیا۔

"خدا حافظ بیٹا!" رمضانی نے کہا۔ "میں یہیں ملوں گا۔ دیر ہو جانے کی فکر نہ کرنا۔"

ہیلن نے تانگا بڑھا دیا۔ "تمہیں بھی سکھا دوں گی تانگا چلانا۔ بڑا مزہ آتا ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے بابا نے تمہیں تانگا کیسے دے دیا۔"

"کیوں نہ دیتے میری عمر اسی علاقے میں گزری ہے۔ چھوٹی سی تھی جب سے جانتی ہوں بابا کو۔ بہت چلایا ہے میں نے یہ تانگا۔"

ماجد اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ بڑے ماہرانہ انداز میں تانگا چلا رہی تھی۔ ماجد کا جی بھی چاہنے لگا۔ اس کی فرمائش پر ہیلن نے اسے تانگے کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔

وہ کلفٹن پہنچ کر مزار سے ساحل کی طرف جانے والی سڑک پر مڑے تو گھوڑے کی باگیں ماجد کے ہاتھ میں تھیں۔

"ساحل پر خوب تیز دوڑانا اسے۔" ہیلن نے بچوں کے سے معصوم لہجے میں فرمائش کی۔

کچھ دیر بعد تانگا ساحل کے ساتھ ساتھ پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ تیز ہوا ان دونوں کے بال اُڑا رہی تھی۔ ان کے لبوں پر معصوم مسکراہٹ تھی اور انداز میں بچوں کی سی بے فکری۔ لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن وہ ہر چیز سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ وہ اس وقت جہاں تھے' وہ ایک عجیب دنیا تھی' خواب خواب دنیا۔

"اب روکو بھی۔" ہیلن نے کہا۔

"گھوڑے کو کہاں باندھیں گے؟" ماجد کے لہجے میں تشویش تھی۔

"یہاں بڑے پتھروں کی کمی نہیں ہے۔"

ماجد نے تانگا روکا۔ دونوں نیچے اترے۔ ماجد نے گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی۔ پھر وہ کف اڑاتی موجوں کی طرف بڑھ گئے۔

سورج سمندر کے سینے پر اترا ہوا تھا۔ وہ دونوں ساحل پر ننھے بچوں کی طرح سیپیاں ڈھونڈتے رہے' پھر تھک کر ریت پر بیٹھ گئے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ماجد انگلی سے ریت پر لکیریں کھینچ رہا تھا اور ہیلن اپنے پیر کے اوپر ریت جمع کر کے اسے ہاتھوں سے پکا کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے گھروندا بنا ڈالا اور اپنا پیر باہر نکال لیا پھر اس نے ماجد کی طرف دیکھا۔ وہ بے خیالی میں ریت پر اس کا نام لکھ رہا تھا۔ ہیلن۔

"اس کے آگے اپنا نام نہیں لکھو گے مجو؟" ہیلن نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

ماجد نے چونک کر پہلے ہیلن کو اور پھر ریت کو دیکھا۔ ہیلن کا نام دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ "ارے' مجھے تو احساس ہی نہیں تھا۔" اس نے کہا۔ پھر اس کی نظر گھروندے پر پڑی۔ "اوہ' تم نے کتنا خوب صورت گھروندا بنایا ہے۔"

"اچھا لگا تمہیں؟"

"بہت اچھا' لیکن اس میں دروازہ تو ایک ہی ہے۔" ماجد نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"ہاں' دروازہ ایک ہی ہونا چاہیے۔" ہیلن نے پُرخیال انداز میں جواب دیا۔ "صرف اندر جانے کے لئے باہر آنے کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ گھروندے تو محبت سے بنائے جاتے ہیں اور محبت میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔"

"اور یہ ہے کس کے لئے؟"

"تمہارے لئے۔"

"اور تم؟"

ہیلن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ماجد نے بے دھیانی میں کہا ہے۔ "تم مجھے اس میں تھوڑی سی جگہ نہیں دو گے؟ میں اسے تمہارے لئے خوبصورت اور آرام دہ بنا دوں گی۔ اسے محبت سے' ایثار سے' اپنے جذبوں کے ساتوں رنگوں سے آراستہ کروں گی۔"

ہیلن کی آواز دور کہیں خوابوں کے کسی جزیرے سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ماجد پھر بے دھیانی میں انگلی سے ریت پر اس کا نام لکھ رہا تھا۔ "کیوں نہیں' میرا گھروندا تمہارا گھروندا ہو گا۔" اس نے بے حد فراخدلی سے کہا۔ "لیکن پھر بھی تمہیں اپنے لئے بھی ایک گھروندا بنانا چاہیے۔"

"گھروندے تو بنائے ہی دوسروں کے لئے جاتے ہیں۔" ہیلن کے لہجے میں عجیب سی اداسی اتر آئی۔ "صرف اپنا معاملہ ہو تو گھروندا کون بنائے۔ آدمی خانہ بدوش بھی تو ہوتا ہے۔ نہیں مجو! گھروندا جب بھی بنایا جاتا ہے تو کسی اور کے لئے ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کوئی اور' اپنوں سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہاں' جب آدمی کسی کا نام لکھتا ہے' خواہ کہیں پر بھی لکھے تو صرف اپنے لئے لکھتا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں محبت میں آدمی کے رجحانات ظاہر کرتی ہیں۔ کوئی کسی کا نام لکھتا ہے اپنے لئے' اور کوئی بڑی محنت اور محبت سے گھروندا بناتا ہے' کسی اور کے لئے۔ یہ تو محبت کے مختلف رویے ہیں۔ یہ تم نے ریت پر جو میرا نام لکھا ہے تو اس لئے کہ میں اس کے آگے تمہارے نام کا اضافہ کر دوں اور میں اپنے نام کے آگے تمہارا نام لکھنا چاہتی ہوں' لیکن نہیں لکھ سکتی۔"

ماجد کو اس کی گفتگو نے مسحور کر دیا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر اترتے دھنک کے

رنگوں کو تکتا رہا۔ ڈوبتے سورج کی الوداعی کرنیں اس کے چہرے پر ناچ رہی تھیں۔ وہ اس وقت بے حد حسین لگ رہی تھی۔ "کیوں نہیں لکھ سکتیں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا نام ہی ایسا ہے۔ زمین پر کیسے لکھ دوں۔" ہیلن نے نہایت سادگی سے کہا۔

ماجد ششدر رہ گیا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"محبت سب کچھ بتا دیتی ہے۔"

ماجد کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ حیران تھا کہ ہیلن یہ سب کیسے جانتی ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ اسے وہ بات کہنے کا حوصلہ ہو گیا جو وہ چاہنے کے باوجود کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"ہیلن میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"تو میں تمہارے لئے گھروندا کس لئے بنا رہی ہوں۔"

"تم اپنا مذہب چھوڑ سکو گی؟"

"کیا یہ شرط ہے شادی کی؟" ہیلن نے چونک کر پوچھا اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگی۔

ماجد بری طرح گڑبڑا گیا۔ "نہیں، لیکن یہ میری خواہش ہے۔"

"تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنا میرے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔" ہیلن نے بڑے پیار سے کہا۔ "اپنا آبائی مذہب چھوڑنا آسان کام نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ انسان کے لئے اپنے نام سے دست بردار ہونا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ میں تمہارے لئے یہ بھی کر سکتی ہوں۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ تم مجھے اس پر مجبور نہ کرو۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جو محض میں تمہاری خوشی کی خاطر نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیوں؟ اس میں حرج کیا ہے؟"

"میں اپنی خوشی کے لئے ایسا کروں گی۔ میں نے تمہیں پہلی ہی ملاقات میں بتایا تھا کہ میں حق کی تلاش میں ہوں۔ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن یہ ایک پہلو میں نے تم سے چھپایا ہے۔ میں اس فیصلے میں کوئی کھوٹ نہیں چاہتی۔ جب کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گی تو سب سے پہلے تمہیں بتاؤں گی۔ میں تمہاری خاطر سب کچھ کر سکتی ہوں مجو! لیکن مجھے اس پر کبھی مجبور نہ کرنا......... پلیز......... پلیز........." وہ سسک رہی تھی۔ ماجد سر جھکائے پشیمان بیٹھا تھا۔ پھر اچانک وہ دونوں بری طرح چونکے۔ پانی کی ایک

زور دار موج ان دونوں کو کمر تک بھگو گئی تھی۔

"اوہ، اوہ میرے خدا یہ کیا ہوا۔" ہیلن کے لہجے میں کرب تھا۔

ماجد نے نظریں اٹھا کر پہلے اسے دیکھا اور پھر نیچے دیکھنے لگا۔ موج دم توڑ چکی تھی۔ پانی سمندر کی طرف پلٹ رہا تھا۔ ہیلن کا بنایا ہوا گھروندا ڈھیر ہو چکا تھا، اور جہاں ماجد نے ہیلن کا نام لکھا تھا، وہاں اب ریت ہی ریت تھی۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہاں کبھی کچھ لکھا ہی نہ گیا ہو۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

ایک روز ماجد دفتر سے لوٹا تو راستے میں شہاب نے اسے روک لیا۔ "ماجد بھائی! آج رات آٹھ بجے شمیم بھائی کے گھر پہنچ جایئے گا۔"

"کیوں بھئی، خیریت تو ہے؟" ماجد نے پوچھا۔

"کوئی میٹنگ ہے۔ ظفر بھائی اور صابر بھائی بھی ہوں گے۔ کچھ لوگ باہر سے بھی آ رہے ہیں۔" شہاب نے بتایا۔

"سلسلہ کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس ہے کوئی اہم معاملہ۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گا۔" ماجد نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

علاقے میں پڑھے لکھے لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔ ان سب کی علاقے میں بڑی عزت تھی۔ اکثر و بیشتر وہ لوگ مل بیٹھتے تھے لیکن باقاعدہ قسم کی میٹنگ کا یہ پہلا موقع تھا۔ ماجد سوچتا رہا کہ اس میٹنگ کا کیا سبب ہو سکتا ہے، لیکن وہ کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

پونے آٹھ بجے ماجد کھانے سے فارغ ہوا اور معمول کے مطابق دس منٹ چہل قدمی میں گزار دیئے۔ پھر وہ شمیم کے گھر کی طرف چل دیا، جو زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ شمیم کے گھر پہنچا تو پورے آٹھ بجے تھے۔ کرکٹ کے کھیل سے اس نے پابندی وقت کا سبق سیکھا تھا۔ اس نے علاقے میں کرکٹ کی ایک ٹیم آرگنائز کی تھی۔ اس وجہ سے علاقے کے نوعمر لڑکے اس سے بہت زیادہ اپنائیت محسوس کرتے تھے۔

بیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر چار پانچ نوعمر لڑکے موجود تھے۔ ماجد ان کے پاس

جا بیٹھا۔ لڑکے اس سے آئندہ میچ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ پھر گفتگو کا رخ میٹنگ کی طرف مڑ گیا۔ فاروق نے ماجد سے میٹنگ کی غرض و غایت کے بارے میں دریافت کیا۔

"بھائی! اس سلسلے میں تو مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔" ماجد نے جواب دیا۔

اسی وقت اندر سے شمیم نمودار ہوا۔ اس نے ماجد سے علیک سلیک کے بعد اسے ایک طرف بلایا۔ ماجد اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"مسئلہ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟" ماجد نے شمیم سے پوچھا۔

"مسئلہ بہت سنگین ہے۔" شمیم نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "تفصیل تو ظفر بھائی اور کرنل ارشاد ہی بتائیں گے۔ میں تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ مسئلہ پاکستان میں عیسائیوں کی بھرپور تبلیغ کا ہے۔ ان دنوں مشنری والوں کی اس علاقے پر خاص نظر ہے۔"

ماجد چور سا ہو گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے شمیم بلاواسطہ طور پر ہیلن کی آمد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ احساسِ جرم کا شکار ہو گیا۔ تاہم اس نے سنبھل کر کہا۔ "مجھے تو اس میں کوئی سنگینی نظر نہیں آتی۔ مجھے یقین ہے کہ جس بچے کے کان میں پہلی آواز اذان کی پڑی ہو، وہ مرتے دم تک مسلمان رہے گا، خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ دنیا کی کوئی ترغیب اسے گمراہ نہیں کر سکتی۔"

"صورت حال اتنی سادہ نہیں ہے، ورنہ یہ میٹنگ کیوں بلائی جاتی۔ بہرحال، تفصیل کا علم تمہیں میٹنگ میں ہو گا۔ فی الوقت تمہارے سپرد ایک اہم کام ہے۔ ممکن ہے، کرنل ارشاد کو آنے میں کچھ دیر ہو جائے۔ میٹنگ ان کی صدارت میں ہو گی۔ تم ذرا لڑکوں کو سنبھالے رکھنا۔ حاضری کم نہیں ہونی چاہئے۔"

"اگر یہ بات تھی تو تم نے میٹنگ آٹھ بجے کیوں بلائی؟" ماجد نے اعتراض کیا۔

"تم تو جانتے ہی ہو، یہاں کسی کو نو بجے بلانا ہو تو آٹھ بجے کا وقت دینا پڑتا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے، میں پورے آٹھ بجے آیا ہوں اور جب میں آیا ہوں تو یہ لڑکے یہاں موجود تھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھو نا، یہ معاملہ مذہبی اہمیت کا ہے۔"

"اور مذہب ہمیں سب سے زیادہ پابندی وقت کی تلقین کرتا ہے، فجر کی نماز عشاء

کے وقت نہیں پڑھی جا سکتی۔ پھر جو لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں بے وقوف ہونے کا احساس ہوتا ہے اور وہ بھی اس رنگ میں رنگنے لگتے ہیں.........."

"چھوڑو یار! تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے۔" شمیم نے چڑ کر کہا۔ پھر نرم لہجے میں بولا۔

"اس وقت تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہے۔ پلیز یار! یہ میری عزت کا سوال ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں کوشش کروں گا، لیکن تمہاری جگہ میں ہوتا تو کرنل صاحب کی عدم موجودگی ہی میں میٹنگ شروع کر دیتا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں کرنل صاحب کی معلومات ہی سب سے زیادہ ہیں۔"

اتنی دیر میں سات آٹھ لڑکے اور آ گئے۔ ماجد انہیں لے کر بیٹھک میں آ گیا۔ پونے نو بجے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر لڑکے بے چین ہونے لگے۔

"بہت دیر ہو گئی ماجد بھائی! اب ہم چلتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"بیٹھو کچھ دیر۔ میرا خیال ہے نو بجے تک میٹنگ شروع ہو جائے گی۔" ماجد نے دلاسہ دیا۔

"یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ ہمیں آٹھ بجے بلایا تھا اور ہم آٹھ بجے آ گئے۔ پون گھنٹا ہو گیا، ہمیں بیٹھے ہوئے۔" نصیر نے احتجاج کیا۔ چند اور لڑکوں نے اس کی ہمنوائی کی۔

"دیکھو، یہ میٹنگ بہت اہم ہے۔" ماجد نے انہیں سمجھایا۔ "مذہبی نوعیت کا معاملہ ہے۔ جہاں تک تمہاری پابندی وقت کا سوال ہے، یہ ذہن میں رکھو کہ اس سے فائدہ بھی تمہیں ہی پہنچے گا۔ جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے، وہ خود کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔"

"فی الوقت تو ہمیں ہی نقصان پہنچ رہا ہے۔" شاکر نے کہا۔ "وقت کی پابندی نہ کرنے والے تو مزے سے اپنے گھر میں بیٹھے ہوں گے۔"

"نقصان تو پہنچتا ہی وقت کی پابندی کرنے والوں کو ہے۔" فاروق بولا۔ "میرا خیال ہے، ہم جیسے لوگوں کو ان جیسے لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا چاہیے۔ ان سے ہمیں بہت بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہم چڑ کر پابندی وقت کا اصول ترک کر سکتے ہیں اور یہ

ہمارے ہی لئے نقصان دہ ہو گا۔"

فضا خاصی مکدر ہو گئی تھی۔ تاہم ماجد نے سمجھا بجھا کر لڑکوں کو روکا۔ سوا نو بجے میٹنگ کے منتظم اعلیٰ ظفر صاحب تشریف لائے۔ لڑکوں کو امید بندھی کہ شاید اب میٹنگ شروع ہو جائے لیکن ظفر نے شمیم کے ساتھ انتظامات کے سلسلے میں کچھ گفتگو کی۔ پھر وہیں بیٹھ گیا۔

"اب کس بات کی دیر ہے؟" ایک لڑکے نے بے صبرے پن سے پوچھا۔

"ابھی مہمانِ خصوصی اور صاحبِ صدر تشریف نہیں لائے ہیں۔" شمیم نے جواب دیا۔

ماجد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکوں سے اپیل کی ورنہ کئی لڑکوں کے تیور بہت ہی خراب تھے۔ پندرہ منٹ تک سکون رہا۔ پھر لڑکوں کا تحمل جواب دینے لگا۔ ماجد کے سمجھانے پر وہ بیٹھے تو رہے، لیکن اب وہ چھینٹے بازی کر رہے تھے، مذاق اڑا رہے تھے، ماجد جانتا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا اور وہ کچھ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کی طبیعت خود اس ناروا جبر پر مکدر ہو رہی تھی۔ میٹنگ کا مقررہ وقت گزرے ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا اور اب تک میٹنگ کے آثار ہی نہیں تھے۔ لڑکے اور مضطرب ہو گئے۔ ان کے اضطراب کی وجہ یہ تھی کہ اگلے روز اتوار تھا اور انہیں کرکٹ میچ کے لئے صبح سویرے اٹھنا تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مذہبی معاملہ ہے تو اس میں مہمانِ خصوصی اور صاحب صدر کے دُم چھلے کی کیا ضرورت ہے؟" نصیر نے کہا۔

"کیوں نہیں ہے۔" فاروقی نے تیز لہجے میں کہا۔ "ورنہ خود نمائی کا شوق کیسے پورا ہو گا؟"

"اور کیا، یہ کرکٹ تو ہے نہیں کہ خود کو نمایاں کرنے کے لئے عملی کارکردگی کی ضرورت پڑے۔" شاکر بولا۔

"ہاں، یہاں تو دوسروں کو انتظار کروانے سے بھی آدمی نمایاں ہوتا ہے۔ اب دیکھ لو، ہم ان کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور اس سے ان کی بڑائی ثابت ہو رہی ہے۔" تنویر نے جھلاہٹ سے کہا۔

"اور آئیں گے تو کیا کر لیں گے، سوائے زبان ہلانے کے۔ کرنا کرانا تو کچھ ہے نہیں۔" نصیر بولا۔

ظفر نے مداخلت کی اور خاصے ترش لہجے میں لڑکوں سے کہا کہ وہ اپنے سے بڑوں کے بارے میں سنبھل کر بات کرنے کی عادت ڈالیں۔ یوں رنگِ محفل اور بگڑ گیا۔ تمام لڑکے واک آؤٹ پر تیار ہو گئے۔ شمیم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ماجد سے مداخلت کی اپیل کی۔ ماجد بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا اور جھنجلا بھی رہا تھا۔ تاہم اس نے بڑے رسان سے کہا۔ "بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب ہم مہمانِ خصوصی اور صاحبِ صدر کا مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ اب آپ میٹنگ کی کارروائی شروع کر دیجئے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" ظفر صاحب نے چمک کر کہا۔

اس بار ماجد بری طرح چڑ گیا۔ "تو پھر آپ ہمارے بغیر میٹنگ کر لیجئے گا۔ ہماری ویسے بھی یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

خوش قسمتی سے اسی وقت باہر کار رکی اور اس میں سے دونوں متنازعہ شخصیتیں برآمد ہوئیں، مولانا بشیر احمد اور کرنل ارشاد، ظفر اور شمیم ان کی پیشوائی کے لئے لپکے۔

"چلیں ماجد بھائی؟" شاکر نے پوچھا۔ تمام لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔

"اب اتنے انتظار کو کیوں اکارت کرتے ہو۔" ماجد نے انہیں سمجھایا۔

کچھ لڑکے زیادہ چڑے ہوئے تھے، وہ وہیں بیٹھ گئے۔ باقی ماجد کے ساتھ کھڑے رہے۔ ظفر اور شمیم مولانا اور کرنل کو اندر لائے اور انہیں سب سے متعارف کرایا۔ انہیں توقع تھی کہ لڑکے گرم جوشی کا مظاہرہ کریں گے لیکن اس کے برعکس انہیں سردمہری کا سامنا کرنا پڑا۔ کرنل صاحب کو اندازہ ہو گیا کہ اس کھنچاؤ کا سبب ان کی تاخیر سے آمد ہے۔ چنانچہ انہوں نے، ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا، کی تشریح شروع کی لیکن لڑکوں کی عدم توجہ کا اندازہ لگانے کے بعد اختصار سے کام لے گئے۔

مہمانِ خصوصی اور صاحب صدر کو مسند پر بیٹھا دیا گیا۔ ظفر نے معلن کے فرائض سنبھالے۔ انہوں نے زبردست لفاظی سے کام لیتے ہوئے صاحب صدر کا تعارف شروع کیا ہی تھا کہ فاروقی اٹھ کھڑا ہوا۔ "دس بجنے میں دس منٹ ہیں ظفر صاحب!" اس نے کہا۔ "ہم آٹھ بجے کے آئے ہوئے ہیں اور ہمیں گھر بھی جانا ہے۔ آپ یہ رسمی باتیں

چھوڑیں اور کام کی بات کریں۔"

ظفر کے چہرے پر تکدر کا سایہ سا لہرایا' لیکن انہیں صورتِ حال کی نزاکت کے پیش نظر خون کے سے گھونٹ پینے پڑے۔ "جی ہاں' آپ کی بات معقول ہے۔" انہوں نے فاروق سے کہا۔ "میں فوری طور پر میٹنگ کی کارروائی کا آغاز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے شمیم صاحب پاکستان میں مسیحیت کی تبلیغ کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کریں گے' شمیم صاحب۔"

شمیم نے اپنا مضمون پڑھنا شروع کیا۔ لڑکے بہت بور ہو رہے تھے' لیکن جیسے جیسے شمیم کی آواز بلند ہوتی گئی' وہ لوگ مسحور ہوتے گئے۔ شمیم کے لہجے میں سوز تھا۔ اس کی باتیں دلوں میں اترتی جا رہی تھیں۔ وہ اعداد و شمار کے حوالے سے حقائق پیش کر رہا تھا۔ اس نے نہایت ہولناک نقشہ کھینچا تھا۔ وطن عزیز میں مسیحیت قبول کرنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی۔ پھر اس نے مسیحیت کے طریق کار کا جائزہ لیا اور اس سلسلے میں مشنریوں کے ہتھکنڈوں کا ذکر کیا۔ تبلیغ دین مسیحیت کی تاریخ بھی بیان کی۔ وہ مسلسل دس منٹ تک بولتا رہا۔ اس دوران بیٹھک میں مکمل سناٹا تھا۔ سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ہر شخص اس کا مضمون پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ لڑکوں کے چہرے جوش سے تمتما اٹھے تھے۔ بالآخر شمیم نے اپنا مضمون مکمل کیا۔

اس کے بعد ظفر نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ پھر اس نے مولانا بشیر کو پکارا۔ مولانا نے وضاحت سے بتایا کہ اسلامی ریاست میں اسلام کے علاوہ کسی مذہب کی تبلیغ و ترویج کا شرعاً سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے عام ٹیکس نہیں لئے جاتے بلکہ صرف جزیہ لیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان جیسے بڑے ملک میں مسیحیت کی اتنے بڑے پیمانے پر تبلیغ اور شمیم صاحب کے پیش کردہ اعداد و شمار ہم سب کے لئے باعث شرم ہیں۔ ہمیں اس سلسلے میں کوئی مؤثر عملی قدم اٹھانا ہوگا۔

مولانا کے بعد صاحب صدر کرنل ارشاد کی باری تھی۔ اب تک میٹنگ نہایت کامیاب رہی تھی' لیکن اب زوال کا آغاز ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ کرنل صاحب کو صرف بولنے کا شوق ہے۔ شاید گھر پر انہیں بولنے کا موقع نہیں ملتا ہوگا۔ ان کی باتوں میں ٹھہراؤ تھا نہ تسلسل۔ وہ بے فیض اور غیر متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں یہ حال ہوا کہ

لڑکوں نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ پھر بار بار گھڑی دیکھی جانے لگی۔ کرنل صاحب بے مغز تقریر کرتے رہے۔ ان کا ایک گھنٹے سے پہلے تقریر ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں گم تھے۔ حاضرین سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا' لڑکوں کی بے چینی بڑھتی گئی۔ بہ آواز بلند جماہیاں لی جانے لگیں لیکن کرنل صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر لڑکوں نے ایک ایک کر کے کھسکنا شروع کر دیا۔ کرنل صاحب اب اسلام کے مختلف فرقوں کے سلسلے میں بتا رہے تھے۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ زیر نظر مسئلے کے لحاظ سے وہ کتنی مخدوش گفتگو کر رہے ہیں۔ اس وقت تو ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کی مرکزیت کو اجاگر کیا جائے۔

ماجد نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکوں کو بڑی مشکل سے روکے رکھا تھا۔ پھر کرنل صاحب کو حاضرین کا احساس ہوا' جن کی تعداد اب صرف چھ رہ گئی تھی۔ انہوں نے جلدی سے گھڑی دیکھی اور بولے۔ "اوہ' شاید میں کچھ زیادہ بول گیا ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب تک تو مجھے گھر پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

ظفر نے اس درخواست کے ساتھ میٹنگ برخواست کرنے کا اعلان کیا کہ ایک ماہ بعد اس سلسلے میں دوسری میٹنگ ہوگی' جس میں اس میٹنگ کے تمام شرکاء اس مسئلے کے سلسلے میں اپنی اپنی تجاویز پیش کریں گے۔ پھر اس نے کرنل صاحب کو بمشکل چائے کے لئے روکا' جو گھر جانے پر تلے بیٹھے تھے۔

کرنل صاحب اور مولانا بشیر کے جانے کے بعد ظفر' شمیم اور ماجد کے درمیان اس سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ "مسئلہ واقعی سنگین ہے۔" ماجد نے کہا۔ "لیکن مجھے آپ کی اپروچ سے اختلاف ہے۔ بات تقریروں کی نہیں بلکہ عمل کی متقاضی ہے۔ لڑکے ہی اس سلسلے میں ہمارا ہراول دستہ ثابت ہوں گے۔ وہ اچھے خاصے پُرجوش ہو رہے تھے لیکن کرنل صاحب کی تقریر نے انہیں سلا دیا' بے زار کر دیا۔"

"کرنل صاحب کام کے آدمی ہیں۔" ظفر نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"بہرحال' دیکھیں گے' فی الحال تو ہمیں عملی تجاویز کا انتظار ہے۔"

☆======☆======☆

ہیلن سے ملاقات کے بعد ماجد کے لئے وہ پہلی رات تھی جو سہانے خوابوں کے

بجائے' اضطراب اور کشمکش میں گزری۔ ایک سوال اسے رہ رہ کر تنگ کر رہا تھا۔ کہیں وہ نادانستگی میں اسلام کے خلاف مسیحیت کا آلہ کار تو نہیں بن گیا ہے؟ وہ اس رات ٹھیک طرح سے سو نہیں سکا اور صبح بہت دیر سے اٹھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اتوار کا دن تھا اور آفس کی چھٹی تھی۔

اگلی شام وہ گھر واپس آیا تو امی کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ "تم مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے رہے ہو ہیلن کے سلسلے میں؟" انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"جھوٹ.......... ہیلن کے سلسلے میں؟ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"آج نمی نے ہیلن کو دیکھ لیا۔ اس کے جانے کے بعد نمی نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی تو علاقے میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے آئی تھی۔"

ماجد کو بروقت سوجھ گئی۔ "ہرگز نہیں' میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اس سے دفتری کام کے سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ گھر آنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے اپنا پتا دے دیا۔ اس روز وہ آئی تو اتفاق سے اس کا ایک ہم مذہب یہاں لٹریچر بانٹتا پھر رہا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

امی مطمئن نہیں ہوئیں۔ "خیر اب میں اسے منع کر دوں گی یہاں آنے سے۔" انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ماجد ذہنی پریشانی کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس نے وہ بات بڑی آسانی سے کہہ دی' جو وہ عام حالات میں کبھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ "آپ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

امی کا چہرہ فق ہوگیا۔ "کیا بک رہا ہے بدبخت' وہ کرسچن ہے۔"

"ہوتی رہے' میں تو اس سے شادی کروں گا۔"

یوں مقدمہ ابا کی عدالت میں چلا گیا۔ ابا بڑے ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر ماجد کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ "بھئی' زندگی ماجد کو گزارنا ہے تو فیصلہ بھی یہی کرے گا کہ اس کا جیون ساتھی کون ہو گا۔" انہوں نے بیوی سے کہا۔ "مجھے اس کا ہر فیصلہ قبول ہوگا' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس کا کوئی فیصلہ ہمارے لئے تکلیف دہ ثابت نہیں ہو گا' اگر

اسے کوئی عیسائی لڑکی پسند ہے تو ہم اسے اپنی بہو بنائیں گے اور بیٹیوں سے بڑھ کر چاہیں گے۔"

امی احتجاج کرنا چاہتی تھیں' لیکن اپنے شوہر کے اس لہجے کو خوب پہچانتی تھیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب کچھ کہنا بے سود ہے۔ دوسری طرف ماجد کے ذہن پر بوجھ بڑھ گیا۔ ابا کو کتنا اعتماد ہے اس پر۔ گویا اسے ابا کے اعتماد کی لاج رکھنا ہے۔

وہ جھنجلا کر گھر سے نکلا اور ہیلن کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ ہیلن کو ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ ہیلن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ پریشان ہے۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ماجد کے سامنے چائے کی پیالی رکھنے کے بعد پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آج تم گھر آئی تھیں۔ نمی نے امی کو تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا۔" ماجد نے کہا۔

"کون نمی؟" ہیلن نے پوچھا۔ پھر اسے نمی یاد آ گئی۔ "اوہ' وہ خوب صورت لڑکی' جو بڑی محبت سے چائے بنا کر تمہیں پلاتی ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔ امی کہہ رہی تھیں کہ تمہیں گھر آنے سے منع کر دیں گی۔"

ہیلن کا چہرہ زرد ہو گیا۔ "میں جانتی تھی۔ جھوٹ ہمیشہ ذلیل کراتا ہے آدمی کو۔" اس نے کہا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "اور بھی کوئی بات ہے؟"

ماجد کی دبی ہوئی جھنجلاہٹ قوت بن کر زبان میں آ گئی۔ "ہاں' بہت سی باتیں ہیں۔ یہ اسلامی ملک ہے اور تم لوگ تبلیغ کے نام پر یہاں دندناتے پھر رہے ہو' تم خود ہمارے علاقے میں پہلی بار آئیں تو تبلیغ ہی کے سلسلے میں آئیں۔"

ہیلن حیران رہ گئی۔ چند لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں بولی۔ "جہاں تک میرا تعلق ہے' میں تم سے معذرت کر چکی ہوں۔ رہا دوسروں کا سوال تو میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"مجھ سے تو تم نے معذرت کرلی' لیکن تمہارا تبلیغ کا سلسلہ شہر کے دوسرے علاقوں میں تو جاری ہوگا۔" ماجد نے تند لہجے میں کہا۔

"بہت بدگمانی کرتے ہو۔" ہیلن نے بڑے پیار سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ

میں تو خود حق کی تلاش میں ہوں۔ میں کیا تبلیغ کروں گی۔ اس دن بھی مجبوراً آئی تھی بادلِ ناخواستہ۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ تم سے ملاقات ہونی تھی اسی بہانے۔ مجو! میں نے کبھی تبلیغ میں حصہ نہیں لیا۔ اچھا بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟"

ماجد نے اسے میٹنگ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بڑے غور سے سنتی رہی۔ ماجد وہ اعداد و شمار دہراتا رہا' جو شمیم کے مضمون کے ذریعے معلوم ہوئے تھے۔

"اور تم جذباتی ہو گئے۔" ہیلن نے اس کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔ "حالاں کہ تمہیں صورت حال پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کر کے اس کا تجزیہ کرنا چاہیے۔"

"اگر میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟" ماجد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو نا' بنیادی طور پر یہ حکومت کی ذمے داری ہے اور حکومت کو یہ یاد دلانا علما کا کام ہے۔ عام لوگ انفرادی و اجتماعی سطح پر اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں کہ ان دونوں پارٹیز کو اپروچ کریں۔ فیصلہ کرنا تو بہرحال اوپر والوں کا کام ہے۔"

ماجد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ ہیلن کا استدلال واقعی معقول تھا۔

☆======☆======☆

دوسری میٹنگ میں شرکاء کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ جب تجاویز پر غور کرنے کا مرحلہ آیا تو پتہ چلا کہ کسی کے پاس اس سلسلے میں کوئی ٹھوس اور قابل عمل تجویز نہیں ہے۔ صرف ایک تجویز تھی۔ جس پر شد و مد سے غور کیا جا رہا تھا اور وہ تجویز ایک انجمن کی تشکیل کی تھی۔ خاصے غور اور خوض کے بعد انجمن کا نام تجویز ہوا۔ "انجمن تحفظ اسلام!" اس کے بعد عہدے دار نامزد ہوئے۔ کرنل ارشاد نے صدارت کی پیش کش معذرت کے ساتھ مسترد کر دی' کیوں کہ سرکاری پالیسی کے مطابق یہ ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ البتہ طے ہو گیا کہ آف دی ریکارڈ انجمن کے سربراہ وہی ہوں گے۔ صدارت ظفر صاحب کے حصے میں آئی۔ ہمدانی صاحب کو نائب صدر بنایا گیا۔ جنرل سیکرٹری کا عہدہ شمیم کو ملا۔ وہ لوگ ماجد کو جوائنٹ سیکرٹری کا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن ماجد نے معذرت کر لی۔ چنانچہ نفیس کو جوائنٹ سیکرٹری بنا دیا گیا۔ نفیس' ماجد کا پڑوسی اور نمی کا بھائی تھا۔ مولانا بشیر انجمن کے خازن مقرر ہوئے۔ کرنل صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ اسی ہفتے انجمن کو رجسٹرڈ کرا دیں گے۔

ماجد اس میٹنگ سے خاصا مایوس تھا۔ اصل مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی تجاویز پیش کیں تو اس پر تمام عہدے داروں کے چہرے اتر گئے۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں عملی قدم اٹھائیں گے اور آئندہ ماہ میٹنگ کے دوران بتائیں گے کہ ان اقدامات کا کیا نتیجہ نکلا لیکن یہ وعدہ کرتے ہوئے ان کا لہجہ نیم دلانہ تھا۔

دوسری طرف گھر میں امی اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ ثمینہ اور زرینہ کئی بار پوچھ چکی تھیں کہ ہیلن کیوں نہیں آتی۔ "بھائی جان نے منع کر دیا ہوگا۔" زرینہ نے چمک کر کہا تھا۔ ماجد نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اس روز ماجد اور ہیلن کیفے اوڈین میں بیٹھے تھے۔ ماجد' ہیلن کو دوسری میٹنگ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہیلن بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تفکر کا غبار تھا۔

"دیکھ لینا' اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔" اس نے ماجد کے خاموش ہونے کے بعد کہا۔

"کیوں؟ یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"تم بہت بھولے ہو مجو!" ہیلن نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے ملک کو جو غیر ملکی امداد ملتی ہے' وہ مشروط ہوتی ہے۔"

"تو اس سے کیا ہوا؟ کیا مطلب ہے تمہارا"؟

"اس امداد کی ایک شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ مشنریز کو تبلیغ کی نہ صرف یہ کہ اجازت دی جائے گی بلکہ انہیں حکومت کی طرف سے ہر ممکن سہولت بھی حاصل ہوگی۔ جو حکومت یہ وعدہ کر چکی ہو وہ مشنریز پر پابندی کیسے لگا سکتی ہے ذرا سوچو تو سہی۔"

ماجد کا دماغ گھوم گیا۔ "نہیں یہ ناممکن ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس نے تند لہجے میں کہا۔

"یہ حقیقت ہے مجو! دیکھ لینا' اس ملک میں اسلامی نظام آنے کے بعد بھی یہ پابندی نہیں لگے گی۔"

"ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ تمہاری خواہش تو ہو سکتی ہے' حقیقت نہیں۔"

"تم واقعی بدگمانی کرتے ہو' جذبات سے کام لیتے ہو۔ ایسے لوگ تجزیہ کر ہی نہیں سکتے۔ اچھا' ایک بات بتاؤ' اسلام کامل مذہب ہے نا؟"

"یقیناً ہے۔" ماجد نے تندی سے کہا۔

"اور دلوں میں گھر کر کے باطن میں انقلاب لانے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے؟"

"یقیناً' اس لئے کہ حق ہے۔"

"تو پھر تم نے کبھی یہ سوچا کہ اتنے سارے مسلمان عیسائی کیوں ہو گئے؟"

"خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہوگی۔"

"نہیں' اس بات کا یہ جواب نہیں ہے۔ یہ تو جذباتیت ہی ہوئی نا۔ اس سوال کے جواب میں تمہیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس میں مسلمانوں کی کون کون سی کمزوریاں عمل پیرا ہیں اور عیسائی مشنری کے پاس لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے بھی یقیناً کچھ ہے' کچھ اچھائیاں' کچھ اچھے عمل۔ تمہیں وہ تلاش کرنا چاہئیں' اپنی کمزوریوں سمیت۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"دیکھو' اسلام نے حقوق اور فرائض کے سلسلے میں جو حد بندی کی ہے' وہ بہت اہم ہے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں' اسلام عملی مذہب ہے اور عمل کی تلقین کرتا ہے' لیکن اس دور میں وعظ ہی وعظ رہ گیا ہے' تقریریں ہی تقریریں ہیں۔ ہر شخص دوسروں کو ہر وقت نصیحتیں تو کرتا ہے لیکن عمل کر کے نہیں دکھاتا۔ اپنے مذہب سے محبت کا دعویٰ تو ہر شخص کو ہے لیکن عملی ثبوت کوئی فراہم نہیں کرتا۔ واعظ لوگوں کو نماز روزے کی تلقین کرتے ہیں لیکن انہیں حقوق العباد کی اہمیت کا احساس نہیں دلاتے۔ یہ تو بات ہے انفرادی سطح کی' اب حکومت کو دیکھو۔ ہر لیڈر اسلام کو بطور نعرہ استعمال کرتا ہے اپنے سیاسی مفاد کے لئے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ حضرت عمرؓ یہ سوچ کر پریشان رہتے تھے کہ وسیع و عریض سلطنت میں کوئی کتا بھی بھوکا رہ گیا تو انہیں خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔ یہاں نہ جانے کتنے گھرانے فاقے سے ہوتے ہیں اور حکومت کے ارکان تو کجا ان لوگوں کے پڑوسی ان کی فاقہ کشی سے بے خبر دعوتیں اڑاتے ہیں۔ کون سوچتا ہے کہ وہ اپنے فرائض ادا نہیں کر رہا ہے' دوسروں کے حقوق پورے نہیں کر رہا ہے' اگر حکمرانوں کے دلوں میں حضرت عمرؓ کا سا خوفِ خدا پیدا ہو جائے تو بائی گاڈ' یہ ملک جنت بن جائے۔"

ماجد مبہوت ہو کر سن رہا تھا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیسے مان

لیتا کہ ہیلن کی اسلام پر اتنی گہری نظر ہے' پھر ہیلن کے لہجے میں سچی عقیدت تھی۔

"اب ذرا مسیحیت کے تبلیغی طریق کار کا جائزہ لو۔ اس کی بنیاد عمل پر ہے' خدمت پر ہے جو اسلام کا زریں اصول ہے۔ عیسائی مشن والے تبلیغ اور خدمت کے ایسے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں کہ انہیں زندگی تک کی پروا نہیں ہوتی۔ انہوں نے وہاں جا کر بھی تبلیغ کی' جہاں مہذب انسانوں کے قدم کبھی نہیں پہنچے تھے۔ وہ آدم خور قبیلوں میں بھی پہنچے' لقمۂ اجل بھی بنے' لیکن جہاں موقع ملا' انہوں نے خدمت کے ذریعے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ یہاں بھی وہ یہی کر رہے ہیں۔ اس بڑے شہر میں اسپتالوں' ڈاکٹروں' نرسوں اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لو۔ یہ بنیادی طور پر خدمت کے پیشے ہیں' معزز پیشے! لیکن عالم کیا ہے۔ خیراتی اسپتالوں میں اسپتال کے عملے کا مریضوں کے ساتھ برتاؤ غیرانسانی ہوتا ہے' حالاں کہ مریضوں کو ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوائیں خرد برد ہو جاتی ہیں اور غریب مریضوں کو مہنگی دوائیں لانے کے لئے میڈیکل اسٹور کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے' تاکہ وہ علاج سے ہی تائب ہو جائیں۔ پرائیویٹ اسپتال صرف بل پر توجہ دیتے ہیں۔ مریضوں کی نگہداشت نہیں کی جاتی۔ انہیں صرف ایک بیڈ دے کر ان پر احسان کیا جاتا ہے۔ کبھی کسی مشنری اسپتال میں جا کر دیکھو جن لوگوں نے وہاں علاج کرایا ہے' ان سے جا کر پوچھو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔ کوئی دوا موجود نہ ہو' تو باہر سے منگوائی جاتی ہے' خواہ ضرورت مند کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ مشن تبلیغی فنڈ کو بڑے سلیقے سے استعمال کرتا ہے۔ اس معاملے میں کوئی بدعنوانی نہیں کرتے وہ لوگ۔ پھر مجو! ایک بات اور ہے۔ پیٹ سب سے بڑا مذہب ہے۔ اور غربت سب سے بڑی کمزوری۔ ضرورت مند کی ضرورت جہاں سے پوری ہوگی' وہ وہیں کا ہو جائے گا۔ غریبوں کو اچھوت بنا کر ان کے حال پر چھوڑ دینا مخدوش ہے۔ کبھی تمہاری تبلیغی جماعت کے کھاتے پیتے لوگ' جن کے لباس بے شکن ہوتے ہیں اور چہروں پر فراغت تحریر ہوتی ہے' گندی بستیوں کی تنگ گلیوں میں جاتے بھی ہیں تو انہیں نماز کی تلقین کرتے ہیں' برتری کے احساس کے ساتھ' برتری کے لہجے میں' جس میں بڑی غیریت ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتے کہ تم نے آج کھانا کھایا ہے یا نہیں' تمہارے بیمار بچے کو دوا میسر ہے یا نہیں' یہ تمہاری بچیاں غربت کی عریانی میں کیوں مبتلا ہیں ہمارے ہوتے ہوئے۔ آؤ ہم تمہارے ساتھ تمہارے گھر کے کچے فرش

پر بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں' وہ یہ ہے کہ ضروریات سے محروم آدمی ان کا وعظ سن کر مذہب سے اور دور ہو جاتا ہے۔ یہ ردِ عمل فطری ہے' اسلام نے خود زور دیا ہے کہ اصرار پر خدمت کو فوقیت حاصل ہے اسلام نے اکراہ سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

"جب عیسائی مشنری کے لوگ انہی گلیوں میں جاتے ہیں تو لوگوں سے ان کے مسائل پوچھتے ہیں' انہیں ممکنہ طور پر حل کرتے ہیں۔ حل نہ کر پائیں تو کم از کم اپنے اجلے لباسوں سمیت وہ ان غربت کے مارے لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ وہ انہیں اچھوت ہونے کا احساس نہیں دلاتے۔ وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب بتاؤ' کامیاب کون ہو گا.......... تم یا وہ؟"

ماجد خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس وقت بڑی اذیت میں تھا۔ ہیلن کا سچ بے حد سفاک اور کاٹ دار تھا اور اسے پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے بے حد تلخ لہجے میں کہا۔ "تم تو یہی کہو گی' اور تم سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ تم انہی کی طرف داری کرو گی' انہی کو برتر و بہتر ثابت کرو گی۔"

ہیلن کے چہرے پر کرب کا سایہ سا لہرا گیا۔ "میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر اسلامی تعلیمات پر عمل کرو تو برتر و بہتر تو تم ہی ہو' اگر عمل نہیں کرتے' تو نہیں ہو اور اس میں قصور نہ میرا ہے نہ اسلام کا۔" اس نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔ "میں تو غیر جانب داری سے بات کر رہی ہوں۔ میں نے انہیں اپنے لوگ نہیں کہا' اپنے ہم مذہب کہہ کر ان کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں ان میں ہوں ہی نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کسی کی بھی نہیں ہوں۔ میں تو اپنی منزل ڈھونڈ رہی ہوں۔ بہت تنہا ہوں میں۔ یہ سب کچھ میں نے کسی منفی جذبے کے تحت نہیں کہا۔ میں تو تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تو بس تمہارا آئینہ ہوں' اور جب آدمی یا قوم یا نسل آئینے سے ڈرنے لگے' چڑنے لگے تو اس کے لئے اپنا احتساب کرنا' خود کو ٹٹولنا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

یہ آخری بات ماجد کو بہت بری لگی' ڈس گئی اسے۔ "بس' بند کرو یہ بکواس۔" اس نے انتہائی سخت لہجے میں کہا اور جیب سے دس کا نوٹ نکال کر کیتلی کے نیچے دبایا اور ٹھنڈی چائے کی پیالی چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اس نے ہیلن کی آنکھوں میں امنڈتے ہوئے آنسو بھی نہیں دیکھے۔

☆======☆======☆

تیسری میٹنگ میں وہی کچھ سامنے آیا' جس کی پیش گوئی ہیلن نے پہلے ہی کر دی تھی۔ مولانا بشیر نے علماء سے رابطہ قائم کیا تھا۔ علماء کا کہنا تھا کہ اسلامی ملک میں کسی مذہب کے پیرو کاروں کو تبلیغ کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ بات وہ لکھ کر دینے کے لئے تیار تھے لیکن وہ حکومت سے یہ مطالبہ کرنے پر آمادہ نہیں تھے کہ مشنریز پر پابندی لگائی جائے۔ نہ انہوں نے اس سلسلے میں تحریک چلانے کی ہامی بھری۔

دوسری طرف کرنل ارشاد اور ظفر نے قومی اسمبلی کے ان گنت ممبروں سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ ممبروں کا کہنا تھا کہ اس طرح غیر ملکی امداد بند ہو سکتی ہے اور ملک کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ انہوں نے معذرت کی کہ وہ اس قسم کی کوئی تحریک قومی اسمبلی میں پیش نہیں کر سکتے۔

ماجد نے جو کچھ سنا تھا' ہیلن کا نام لئے بغیر انجمن کے عہدے داروں کے گوش گزار کر دیا۔ اس بات کی معقولیت سبھی نے تسلیم کی۔ دشواری یہ تھی کہ فی الوقت ان کے پاس فنڈ نہیں تھا۔ طے یہ پایا کہ پہلے اپنے ہی علاقے میں صفائی کی مہم چلائی جائے گی۔ اس کے لئے دن اور وقت کا تعین کر لیا گیا۔ کرنل ارشاد نے کہا کہ وہ انجمن کے فنڈ کے لئے کچھ صنعت کاروں سے بات کریں گے۔

وہ ماجد کے لئے بے حد عذاب ناک دن تھے۔ وہ ہیلن کو بھولنا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے ۲۱ نمبر بس میں جانا چھوڑ دیا۔ وہ ہیلن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہیلن کے گھر جانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ عجیب کش مکش میں مبتلا تھا۔ ہیلن کبھی اسے سچی لگتی اور کبھی فریبی۔ اس کے باوجود وہ سونے کے لئے لیٹتا تو وہ اس کے تصور میں آ کھڑی ہوتی اور شکایتی نظروں سے اسے تکتی رہتی۔

صفائی کی مہم والے دن ماجد مقررہ جگہ پر اکیلا کھڑا انجمن کے عہدے داروں کا انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے ہو گئے لیکن کوئی نہیں آیا۔ تنگ آ کر وہ گھر چلا آیا۔ اگلے روز ظفر اور شمیم سے ملاقات ہوئی تو اس نے ان سے وعدہ خلافی کی شکایت کی۔ دونوں نے بہانے بنا دیے کہ وہ کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے پھر شمیم نے کہا۔ "تم نے بھی تو حد کر دی یار! اب ہم لوگ جھاڑو لگاتے ہوئے کیا اچھے لگیں گے۔ یہ بھنگیوں کا کام ہے۔ انہیں

پیسے دے کر صفائی کرائی جائے گی۔ ذرا فنڈ تو اکٹھا ہو جائے۔"

ماجد اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا' لیکن کچھ کہنا فضول تھا۔ وہ لوگ اس کام کی افادیت کو سمجھ ہی نہیں رہے تھے۔ ہیلن کی یہ بات بھی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ بے زاری کے عالم میں وہاں سے چلا آیا۔

اگلے روز اسے پتا چلا کہ شہر کی ایک پسماندہ بستی میں ایک بیوہ عورت اپنے بچے سمیت عیسائی ہو گئی ہے۔ اخباروں میں قبولِ اسلام کی خبریں تو چھپتی ہیں لیکن ایسی عبرت خیز خبروں کو جگہ نہیں ملتی کہ کہیں عوام جذباتی ہو کر حکومت اور مشنریز کے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ ماجد نے وہ خبر دفتر میں اپنے ایک دوست کی زبانی سنی جو اس بستی میں رہتا تھا' جہاں یہ واقعہ ہوا۔

شبیر نے اسے بتایا کہ وہ بیوہ عورت اپنے چھ سالہ بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کا گزارا سلائی پر تھا۔ ایک سال پہلے اس کے بچے کو کوئی بیماری لاحق ہو گئی۔ خیراتی اسپتال والوں نے جواب دے دیا کہ مرض ان کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا...... عورت نے شہر کے تمام خیراتی اسپتالوں کے چکر کاٹے لیکن ہر جگہ ایک ہی جواب ملا۔ ایسے ہی ایک اسپتال میں اس کی ملاقات ایک کرسچن نرس سے ہو گئی۔ نرس نے اس کا پتا لے لیا۔ اگلے روز مشنری والے اس کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے بچے کو پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا۔ چھ ماہ بعد بچہ صحت مند ہو گیا۔ مشنری والوں نے اس عورت کی روپے پیسے سے بھی مدد کی' کیوں کہ بچے کی بیماری اور اسے لانے لے جانے اور تیمارداری کی وجہ سے سلائی کا کام بھی کم ہو گیا تھا اور فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔ پڑوس والے یہ سوچ کر کترانے لگے تھے کہ پیسے دیں گے تو واپس نہیں ملیں گے۔ "کل اس نے باقاعدہ عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔" شبیر نے بتایا۔ "محلے کے لوگوں نے پہلے اسے سمجھایا' پھر لعنت ملامت کی اور دھمکیاں بھی دیں لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔ کہتی تھی' میرا بچہ مر رہا تھا تو تم میں سے کس نے پوچھا؟ میں فاقے کرتی تھی تو تم نظریں چراتے تھے۔ تم سے تو وہ غیر اچھے' جنہوں نے میرے لئے اتنا کچھ کیا اور مجھ سے مذہب تبدیل کرنے کو بھی نہیں کہا۔ میں اپنی خوشی سے عیسائی ہوئی ہوں۔ پھر مشنری والوں نے اسے مسیحیوں کی ایک بستی میں مکان بھی دلا دیا۔"

ماجد کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ہیلن کی ایک اور بات درست ثابت ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

اس رات ماجد نے ہیلن کو خواب میں دیکھا۔ وہ بہت اداس اور دلگیر نظر آ رہی تھی۔ خواب میں ماجد نے بہت کوشش کی کہ اسے بولنے پر مجبور کرے' لیکن وہ خاموش رہی۔ بس وہ اداس نظروں سے اسے تکتی رہی۔ "مجھ سے خفا ہو؟" ماجد نے پوچھا۔

ہیلن نے بڑی شدت سے نفی میں سرہلایا۔

"میں نے تمہارا دل دکھایا ہے' تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

اس بار ہیلن نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"مجھے معاف کر دو' آئی ایم سوری...... ریئلی سوری۔"

وہ ایک دم خفا ہو گئی۔ پھر اس نے کہا۔ "لو مینز نیور ہیونگ ٹو سے' یو آر سوری۔"

"آئی ایم موری فار سیئنگ سوری۔" ماجد نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر خود ہی سنجیدہ ہو گئی۔ "تم بہت بدگمانی کرتے ہو۔"

"اب نہیں کروں گا۔"

"وعدہ!" ہیلن نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ماجد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "وعدہ...... پکا وعدہ۔"

ہیلن کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ "یہ بات نہیں کہ میں تمہارے دیئے ہوئے دکھوں سے یا ان دکھوں سے ڈرتی ہوں' جو تم مستقبل میں مجھے دو گے۔ میرے لئے تو وہ بھی سرمایۂ حیات ہوں گے۔ میں تو صرف اس بات سے ڈرتی ہوں کہ کہیں اس کے باوجود تم مجھے اکیلا نہ چھوڑ دو۔"

"ایسا کبھی نہیں ہو گا۔" ماجد نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اپنا یہ جملہ اس نے خود بھی سنا تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اسے اپنے دل پر ناقابل بیان بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے چھ بجے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ اٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا' کپڑے بدلے اور گھر سے نکل آیا۔ امی ناشتے کے لئے کہتی رہ گئیں۔

وہ ہیلن کے گھر پہنچا تو سوا سات بجے تھے۔ ہیلن اسے دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور

خوش بھی۔ شیلا کالج کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ میری آفس کے لئے نکل چکی تھی۔ پاپا بستر پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ماجد کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ "او مائی سن' گڈ مارننگ.......... اٹنا ڈن کے بعد آیا.......... کھفا ہے ام سے؟"

"ارے نہیں پاپا! آپ سے کیسے خفا ہو سکتا ہوں میں۔" ماجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"چلو' اچھا ہوا' ناشتا ساتھ کریں گے۔ اے اسٹیلا! ناشتا لاؤ امارے اور ماجدؔ کے واسطے۔" اس نے بیوی کو پکارا۔

ناشتے کے بعد ہیلن دفتر کے لئے تیار ہوئی۔ ماجد اس کے ساتھ ہی گھر سے نکل آیا۔ وہ دونوں بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے رہے۔ پھر ماجد نے کہا۔ "آج دفتر سے چھٹی کر سکتی ہو؟"

ہیلن نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟ تم چاہتے ہو کہ میں آج چھٹی کر لوں؟"

"ہاں۔"

"تو سمجھ لو' ہو گئی چھٹی' لیکن کریں گے کیا؟"

"پہلے کہیں چل کر چائے پئیں گے۔ وہاں بیٹھ کر سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔" ماجد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اسے خوف تھا کہ ہیلن کہے گی۔ "وہاں بیٹھ کر تو تم لڑو گے مجھ سے۔" لیکن ہیلن نے کچھ نہیں کہا۔ صرف سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گئی۔ "آج میرا جی چاہتا ہے کہ ہم اسکول سے بھاگے ہوئے بچوں کی طرح آوارہ گردی کریں۔" ماجد نے مزید کہا' پھر پوچھا۔ "پیسے کتنے ہیں تمہارے پاس؟"

ہیلن یہ سن کر کھل اٹھی۔ اس سے پہلے ماجد نے کبھی اسے کوئی بل ادا نہیں کرنے دیا تھا۔ "بہت پیسے ہیں میرے پاس۔ چار سو روپے سے زیادہ۔"

"اتنے سارے! تب تو وہ گھر کے خرچ کے ہوں گے۔" ماجد نے کہا۔

"نہیں مجو! کل ہی تو مجھے بونس ملا ہے۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔"

باتیں کرتے کرتے وہ کیفے اوڈین تک آ گئے تھے۔ وہ اوپر جا بیٹھے اور انہوں نے چائے منگوا لی۔ ماجد نے چائے کی ٹرے اپنے سامنے کھینچ لی۔ "آج چائے میں بناؤں گا۔" اس نے کہا۔

"نہیں مجو! پلیز۔" ہیلن نے بچوں کی طرح ضد کی۔ "تمہارے لئے چائے بنا کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"آج تو میں ہی بناؤں گا۔ ویسے بھی تم گھر پر میرے لئے چائے بنا کر اپنی خوشی پوری کر چکی ہو۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" ہیلن کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا میں تمہارے ہاتھ کی چائے کا ذائقہ نہیں پہچانتا؟" ماجد نے آنکھیں نکال کر کہا اور چائے کی پیالی اس کی طرف کھسکا دی۔

"اچھا' اس عنایت کی کوئی خاص وجہ؟"

"بڑی بدگمان ہو۔" ماجد نے کہا اور خود ہی جھینپ گیا۔ بدگمان تو وہ خود تھا۔

"نہیں' لیکن مجھے لگتا ہے' تم خوامخواہ کسی بات کی تلافی کے چکر میں ہو' حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت تو ہے۔ اچھا' یہ بتاؤ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں' میں خفا ہو بھی نہیں سکتی۔ تم سے خفا ہو کر تو مر جاؤں گی میں۔ مجو پاگل! تم نے ایسی بات سوچی کیسے؟" وہ جذباتی ہو گئی۔

"میں نے زیادتی جو کی تھی۔" ماجد نے کہا۔ "اچھا' تم خفا نہیں تھیں تو مجھے فون کیوں نہیں کر لیا تم نے؟"

"آزاد خیال تو ہوں۔" ہیلن نے آہ بھر کے کہا۔ "لیکن نسوانی وقار کا احترام ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ انا کی بات نہیں۔ میری غلطی ہوتی تو میں تمہیں اگلے دن ہی فون کر لیتی' لیکن غلطی تمہاری تھی اور پھر مجھے یقین تھا کہ تم لوٹ آؤ گے۔ یہ یقین نہ ہوتا تو خود ہی فون کر لیتی شاید۔ مجو! تم میرے لئے بہت قیمتی ہو اور میں گھروندے بنانے والوں میں سے ہوں۔ نام لکھنے والوں میں سے نہیں۔"

ماجد جھینپ گیا۔ "ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں خود غرض بھی ہوں اور انا پرست بھی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ میں تمہاری محبت کے قابل.........."

ہیلن نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی باتیں نہ کرو مجو!" اس نے

تیز لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے' ماجد بہت زیادہ شرمندہ تھا۔ اس دنیا میں کون کسی کو اتنا چاہتا ہے' خود سے بھی زیادہ۔

چائے ختم کرنے کے بعد ماجد نے پیالی ایک طرف کھسکائی اور آہستہ سے کہا۔

"ہیلن! تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"کیوں نہیں' کب شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ہیلن! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" ماجد نے احتجاج کیا۔

"میں بھی مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ اتنے سنجیدہ اور اہم معاملات میں کون مذاق کر سکتا ہے۔"

"تو تم تیار ہو؟"

"ہاں' حالاں کہ پچھلی بار کی گفتگو کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہاری بدگمانیاں مجھے دکھ دیتی رہیں گی۔ کاش' میں مسلمان پیدا ہوئی ہوتی۔ بہرحال مجھے ان دکھوں کا کوئی خوف نہیں۔ بس مجھے تم مل جاؤ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔"

ماجد کو اس پر رات کا خواب یاد آ گیا۔ "تم نے رات خواب میں بھی تقریباً یہی بات کہی تھی۔" اس نے کہا اور پھر ہیلن کو پورا خواب سنا دیا۔ ہیلن سنتی رہی۔

"اب تو یقین کر لو میری سچائی کا۔" ہیلن نے کہا۔

"اب کبھی بدگمانی نہیں کروں گا۔"

"وعدہ!" ہیلن نے ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وعدہ............ پکا وعدہ۔" ماجد نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

اس کا خواب سچا ثابت ہو گیا تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ہیلن نے متردد ہو کر کہا۔ "لیکن مجو! ایک مسئلہ ہے۔ تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا جب شیلا تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ میں مما اور پاپا کو بے سہارا نہیں چھوڑ سکتی۔"

ماجد کچھ دیر سوچتا رہا' پھر بولا۔ "یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے' میں خود بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ مما اور پاپا پر کوئی منفی اثر پڑے تم یوں کرنا کہ سروس کرتی رہنا ان دونوں کے

لئے' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"تھینک یو مجو!" ہیلن کے لہجے میں احسان مندی تھی۔ "اچھا اب کیا پروگرام ہے؟"

"یہاں سے پہلے تو چڑیا گھر چلیں گے' اور پھر............"

"پھر ٹیکسی کر کے ٹیکسی والے سے کہیں گے کہ ہمیں گھماتا رہے' شہر بھر میں۔ میں تمہارے ساتھ ساری دنیا گھومنا چاہتی ہوں کیوں نہ پہلے اپنے شہر سے شروعات کریں۔"

"رائٹ' اور آخر میں ہم کلفٹن چلیں گے۔"

"او کے۔"

وہ سارا دن بچوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بے فکری سے گھومتے رہے۔ انہوں نے کھانا ایک ریسٹورنٹ میں کھایا۔ شام ہوتے ہی وہ کلفٹن پہنچ گئے۔ آٹھ بجے کے قریب وہ ساحل سے اٹھے۔ "اب ہم آج کی آخری چائے پئیں گے' جبیس میں۔" ماجد نے کہا۔

جبیس میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے ماجد نے کہا۔ "ہیلن! تمہیں یاد ہے' آج تم نے کہا تھا کہ کاش تم کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوتیں۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔"

"تو تم مسلمان ہو جاؤ نا۔"

"مجو! آج میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں شروع ہی سے اسلام سے متاثر ہوں لیکن میں تمہاری خاطر مسلمان ہو کر یہ کہلوانا نہیں چاہتی کہ میں تم سے شادی کے لالچ میں مسلمان ہوئی ہوں۔ یہ اسلام کی توہین ہے۔ میں اسلام کی پسندیدگی کی وجہ سے مسلمان ہوں گی۔ پلیز مجو! اس معاملے میں تم مجھ سے ضد نہ کرنا۔" ہیلن کے لہجے میں التجا تھی۔

"ٹھیک ہے۔" ماجد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن پھر شادی کیسے ہو گی؟"

"ایسی بات نہیں۔ اسلام نے اہل کتاب سے نکاح کی اجازت دی ہے۔"

"اچھا۔" ماجد نے کہا............ لیکن اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں' تم چاہو تو پوچھ لینا۔"

"ٹھیک ہے آؤ اب چلیں۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی قربت میں ایک یادگار دن گزارا

تھا۔

☆======☆======☆

اس رات ماجد، ابا کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ابا کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ماجد نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "ابا جی! کیا اہل کتاب لڑکی سے نکاح جائز ہے؟"

ابا نے کتاب آنکھوں کے سامنے سے ہٹائی اور اسے بہت غور سے دیکھا۔ "ہاں بیٹے جائز تو ہے۔" انہوں نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "لیکن عموماً اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ہوتا۔"

"کیسے مسائل؟"

"بھئی بیوی اپنے مذہب پر قائم رہے، تب بھی محبت کے زور پر کام چل جاتا ہے۔ اصل مسئلہ بچوں کی پیدائش کے بعد سامنے آتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ابا جی۔"

"مسئلہ یہ کھڑا ہوتا ہے بیٹے کہ بچوں کا کون سا مذہب ہوگا۔ یہ بات طے ہے کہ بچے ماں سے بہت قریب ہوتے ہیں اور اس کا اثر بہت گہرائی میں قبول کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے، تم یہ کبھی قبول نہیں کرو گے کہ تمہارے بچے عیسائیت کی طرف مائل بھی ہوں۔ یوں رنجشیں پیدا ہوں گی۔ ازدواجی زندگی الگ متاثر ہوگی اور نسلی بگاڑ کا مسئلہ الگ کھڑا ہوگا۔"

"لیکن ابا جی ہمارے ہاں تو امی بھی ہوں گی اور ثمینہ، زرینہ بھی۔ بچے ان سے بھی تو متاثر ہوں گے۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ ابھرنے کا امکان کم ہے۔"

"ہاں بیٹے! کم ہے لیکن ہے تو سہی۔ مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ موہوم سے امکان کا خطرہ بھی مول نہیں لیا جانا چاہئے۔"

ماجد کے چہرے پر اندیشوں کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ ابا جی ایسے ہی تھے۔ ابا بھی اور دوست بھی۔ اپنے طور پر برا بھلا سمجھا دیتے لیکن کبھی کسی چیز سے نہ روکتے۔ سمجھاتے بھی تو استدلال کے ساتھ۔ یہی وجہ تھی کہ عمل کی آزادی ملنے کے باوجود وہ ان کا فیصلہ قبول کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ محبت کیوں کہ قوی تھی، اس لئے وہ پھر بھی اٹک رہا تھا، لیکن ابا جی کی بات کی معقولیت اپنی جگہ تھی۔

ابا نے اسے پریشان دیکھا تو محبت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہارے سوال کا جواب دیا ہے بیٹے! یہ نہ کوئی فیصلہ ہے نہ حکم۔ میں کہہ چکا ہوں کہ جس لڑکی کو تم پسند کرو گے، وہ کوئی بھی ہو اور کیسی بھی ہو، اس گھر میں اسے بہو کا درجہ ملے گا اور محبت و شفقت بھی، لیکن میں تمہیں مستقبل میں پریشان اور مسائل میں گھرا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا۔ آگے جو مرضی مالک کی۔"

"میں جانتا ہوں ابا جی!" ماجد نے ممنونیت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔"

اس رات وہ دیر تک سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔

☆======☆======☆

اگلی صبح اس نے ہیلن کو اس کے آفس فون کیا اور چھ بجے کیفے اوڈین میں ملنے کو کہا۔ حسبِ توقع ہیلن نے ہامی بھر لی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بات کیا ہے۔ ماجد شام تک اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ وہ ہیلن سے محبت کرتا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے بچوں کو خود سے بہتر مسلمان دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات درحقیقت ہیلن کی محبت سے زیادہ اہم تھی۔ اگر ابا سے بات نہ ہوئی ہوتی تو وہ ہیلن کی محبت کو اہم تر قرار دیتا۔ کیوں کہ شادی سے پہلے محبت اہم ترین ہوتی ہے اور اس سے متعلق سنگین مسائل کی طرف آدمی کی نظر کبھی نہیں جاتی۔ البتہ شادی کے بعد چھوٹے چھوٹے مسائل بھی پھیل کر سامنے آتے ہیں۔ بڑے اور سنگین مسائل کی تو بات ہی الگ ہے۔

وہ بھی اسیرِ محبت تھا۔ اگر اسے ہیلن کی بے پناہ محبت پر یقین نہ ہوتا تو شاید وہ ہیلن سے کوئی مطالبہ کرنے کے بجائے اسے جہاں ہے اور جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کر لیتا لیکن اتنے دنوں کے ساتھ کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہیلن اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے فیصلے میں لچک رکھی تھی کیوں کہ وہ بھی ہیلن سے محبت کرتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ہیلن سے مسلمان ہونے کو کہے گا، اگر وہ انکار کرے گی تو اس سے وقتی طور پر قطع تعلق کر لے گا۔ اس صورت میں امکان یہی تھا کہ ہیلن کچھ دن بعد اس کی بات مان لے گی اور اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ہیلن اڑ گئی ہے تو وہ اس سے معذرت کر لے گا، اسے منا لے گا۔ سارا

کھیل تحمل کا تھا۔ مزاحمت کا تھا۔

یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گیا۔ شام کو وہ دونوں ملے۔ ماجد نے ویٹر سے کوکا کولا لانے کو کہا۔ ہیلن حیران نظر آنے لگی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ ماجد اس سے وہ بات کہنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا مطالبہ ہیلن کے لئے تکلیف دہ ہو گا۔

"شادی کے بارے میں کیا سوچا تم نے؟" بالآخر ماجد نے بات شروع کی۔

ہیلن نے نظریں اٹھا کر حیران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "سوچنا کیا ہے' اب تو فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں' لیکن ہیلن! میں چاہتا ہوں' تم شادی سے پہلے اسلام قبول کر لو۔" ماجد نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے' کل ہم اس سلسلے میں بھی حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔"

"اس کے باوجود میں تم سے التجا کر رہا ہوں۔"

"آخر ہوا کیا؟" ہیلن کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

ماجد نے ابا جی کی تمام دلیلیں اس کے سامنے رکھ دیں' پھر کہا۔ "تم یقیناً یہ نہیں چاہو گی کہ ہماری محبت ازدواجی زندگی کی تلخیوں کی نذر ہو جائے۔"

"ایسا ہو گا بھی نہیں' کم از کم میری طرف سے ایسا نہیں ہو گا۔" ہیلن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "لیکن بدگمانی انسان کو اندر ہی اندر جلاتی رہتی ہے' اس کا کوئی علاج ہی نہیں ہے۔"

"یہی سہی' لیکن یہ صورت بھی تو تلخی اور اختلاف کی ہے۔"

"میں تو تمہارا دیا ہوا جہنم بھی قبول کرنے کو تیار ہوں۔" ہیلن جذباتی ہو گئی۔

"لیکن میں تمہیں جنت دینا چاہتا ہوں' اس کے لئے یہ ضرور ہے کہ تم میری یہ التجا مان لو۔ اس کے بعد میں تم سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا۔"

"اور اگر میں صرف تمہیں پانے کے لئے بظاہر اسلام قبول کر لوں تو تمہارے خیال میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔" ہیلن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تم یہ پہلو نظرانداز کر رہے ہو کہ درحقیقت ہر چیز کا انحصار ہماری نیتوں پر ہے اور نیتوں کو جانچنے کا کوئی پیمانہ آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ یہ کام تو باہمی اعتبار پر چلتا ہے۔"

"میں تمہیں جانتا ہوں۔" ماجد نے بڑے یقین سے کہا۔ "تم کھوٹی نہیں ہو' منافقت سے بہت دور ہو تم۔"

"لیکن یہ تو سوچو کہ اتنی بڑی آزمائش میں ڈال کر تم مجھے منافقت کی ترغیب دے رہے ہو۔" ہیلن نے احتجاج کیا۔ "میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی کسی قیمت پر بھی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں' یہ ترغیب بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

ہیلن کچھ دیر سوچتی رہی' پھر اس نے ماجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھ پر یقین رکھتے ہو؟"

"اس سوال کا جواب تو تم خود بھی دے سکتی ہو۔"

"نہیں دے سکتی' تم نے کبھی مجھ پر یقین کیا ہی نہیں۔"

ماجد شرمندہ ہو گیا۔ "تم پر' تمہاری سچائی پر یقین رکھتا ہوں۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جہاں بات عقیدے اور مذہب کی ہو اور دونوں فریقوں کے درمیان یہ فرق موجود ہو' وہاں مکمل یقین اور اعتماد کبھی نہیں پنپ سکتا' لیکن ہیلن اس پر اعتماد کرتی تھی' یقین رکھتی تھی' پھر اس نے سوچا' ممکن ہے' ہیلن کا یقین اور اعتماد محض سطحی ہو' یا ظاہری۔

"میں ضمانت دیتی ہوں کہ ہمارے گھر میں یہ مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہو گا۔" ہیلن نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"یہ.......... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں ضمانت دیتی ہوں کہ میری تربیت کردہ اولاد اسلام کی اس قدر شیدائی ہو گی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ جو تمہاری نمی ہے نا' وہ تو مسلمان ہے نا' پھر بھی وہ تمہارے بچوں کی ایسی تربیت نہیں کر سکتی' جیسی میں کروں گی۔ یقین کرو' ہمارے درمیان یہ مسئلہ کبھی نہیں ہو گا۔ مجھ پر اعتماد کرو مجو!"

ماجد سوچ میں پڑ گیا۔ ہیلن نے بہت بڑا چیلنج کیا تھا اور کمال یہ تھا کہ اس چیلنج میں نمی کو خوامخواہ ملوث کر لیا تھا۔ کچھ بھی سہی' وہ بہرحال لڑکی تھی اور لڑکیاں ذرا ذرا سی بات پر رقابت محسوس کر لیتی ہیں۔ ماجد کو اس کے لہجے میں جذباتیت محسوس ہوئی تھی اور جذباتیت خود بقول ہیلن کے ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ وہ خود اپنے موقف سے پیچھے ہٹنا

نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے ہیلن پر اعتبار نہیں ہے اور اس کی ضمانت وہ قبول نہیں کر سکتا۔ اچانک اسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ ”میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں ہیلن' لیکن امی اور ابا تو نہیں کر سکتے۔“ اس نے کہا اور کہتے ہی اسے ندامت بھی ہوئی کیوں کہ ابا تو صاف کہہ چکے تھے کہ وہ اس کی پسندیدہ لڑکی کو ہر حال میں بہو کا درجہ دیں گے۔ پھر اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کہ اس نے یہ جھوٹ نہ صرف اپنے خاندان اور آنے والی نسلوں کی بہتری کے لئے بولا ہے بلکہ اس نے ایک دینی خدمت میں بھی کی ہے۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ کسی غیر مسلم کو راہِ حق پر لانا کارِ ثواب ہے۔

”یہاں تم نے مجھے لاجواب کر دیا۔“ ہیلن نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”واقعی تمہارے والدین تو آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ بیرا خالی بوتلیں لے گیا۔ پھر وہ بل لایا اور ماجد نے ادائیگی بھی کر دی۔ اس دوران ہیلن کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ اس کی پیشانی پر فکر کی سلوٹیں تھیں۔

”پھر کیا سوچا تم نے؟“ ماجد نے پوچھا۔

”تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں تمہیں پانے کے لئے اسلام قبول کروں گی تو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رہوں گی۔ میری روح مضطرب رہے گی۔ ہمیشہ مجھے کھوٹ کا احساس رہے گا۔ میں کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“ ہیلن کے لہجے میں بے بسی تھی۔

”محبت ہر خلش دور کر دیتی ہے' یہ ہر درد کا مداوا ہے۔ کیا تم محبت پر یقین نہیں رکھتیں؟“

”محبت پر تو ایمان ہے میرا' لیکن مجو کچھ جذبے محبت سے بھی ماورا ہوتے ہیں۔“ ہیلن نے کہا اور پھر سوچنے لگی۔ پھر اچانک اس نے پوچھا۔ ”سچ سچ بتانا مجّو! تم نے کسی سے بات کی تھی۔ آج تم اپنی زبان تو نہیں بول رہے ہو۔“

”میں نے اباجی سے بات کی تھی۔“ ماجد نے بتایا۔

ہیلن پھر سوچ میں پڑ گئی۔ ”تم ہی بتاؤ' میں کیا کروں؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے

سر تھام کر کہا۔

”میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔“

”صرف یہی تو نہیں چاہتے تم۔“ ہیلن نے کہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی۔ ”مجھے مہلت مل سکتی ہے سوچنے کی؟“ اس نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“

”ٹھیک ہے' میں یہ چاہتی ہوں کہ ہم ایک مہینے تک نہ ایک دوسرے سے ملیں نہ فون کریں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرو گے۔“

ساجد بری طرح چونکا۔ ”کیوں' مجھے بھول جانا چاہتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں' جانتی ہوں کہ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“

”تو پھر یہ پابندی کیوں لگا رہی ہو؟“

”جاننا چاہتی ہوں کہ مجھ میں تلاشِ حق کا جذبہ توانا تر ہے یا تمہاری محبت کا۔ میں کوئی خلش پالنے کی عادی نہیں ہوں۔“

”لیکن ایک مہینہ' یہ تو بہت ہوتا ہے۔ میں کیسے رہ سکوں گا تمہارے بغیر؟“ ماجد نے احتجاج کیا۔

”رہ لو گے' تمہیں مجھ سے زیادہ اذیت نہیں ہوگی مجھ سے دور رہ کر۔“

ماجد نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو مجو! میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نسبتاً تمہاری ضرورت زیادہ محسوس کرتی ہوں۔ میں تمہیں زیادہ چاہتی ہوں۔ برا نہ ماننا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ محبتیں بھی رزق کی طرح ہوتی ہیں' مالک جس کو جتنی دے دے اس میں کسی کا کمال نہیں۔“

ماجد خاموش رہا۔ جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے لیکن اس کے دل میں ایک لمحے کے لئے یہ خیال بھی آیا کہ ممکن ہے' یہ دکھاوا ہو پھر اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ شاید وہ اب تک محبت میں یقین کی منزل میں داخل نہیں ہوا تھا۔

”ایک بات یاد رکھنا مجو! جو لوگ محبت میں یقین سے محروم ہوتے ہیں' انہیں کچھ بھی نہیں ملتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ محبت دو طرفہ کھیل ہے۔ یقین دونوں طرف

ضروری ہے' اگر ایک طرف گمان ہو' یقین میں کمی ہو تو دوسری طرف خواہ یقین ایمان کی حد کو پہنچا ہوا ہو' رائیگاں ہو جاتا ہے' اور زیاں کی آگ' جدائی کی آگ دونوں کے لئے یکساں ہوتی ہے۔ یقین والا خوامخواہ مارا جاتا ہے۔ اوہ معاف کرنا' میں بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھی۔ اس وقت ہذیانی کیفیت ہو رہی ہے میری۔"

ماجد کو احساس تھا کہ وہ ہیلن کا ہذیان نہیں تھا۔ وہ اس کی عدم یقینی کو پڑھ چکی تھی اور اس نے جو کچھ کہا' وہ ایک طرح کی پیش گوئی تھی۔ وہ ہذیان ہرگز نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے' خاموش بیٹھا رہا۔ ہیلن سے نظریں ملانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔

"تو وعدہ کرتے ہو مجھ سے کہ ایک مہینے تک نہ مجھ سے ملو گے اور نہ مجھے فون کرو گے؟" ہیلن نے پوچھا۔

"یہ بہت ضروری ہے تمہارے لئے؟"

"ہاں' اس کے بغیر میں فیصلہ نہیں کر سکتی۔"

"تب تو مجبوری ہے' لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔"

"وعدہ کرو.......... وعدہ کرو مجھ سے۔" ہیلن نے تند لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" ماجد نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک جانتا تھا کہ یہ کتنی کٹھن آزمائش کا نقطہ آغاز ہے' لیکن دوسرے کو ابھی اندازہ نہیں تھا۔

☆======☆======☆

وہ ایک مہینہ ماجد پر بہت بھاری گزرا۔ پابندی اور دوری تو یوں بھی ہر چیز کی قیمت بڑھا دیتی ہے' وہ تو پھر ہیلن سے محبت کرتا تھا۔ ہیلن سے کم ہی سہی' لیکن بے طلب تو وہ بھی نہیں تھا۔ اس ایک مہینے میں وہ دنیا کا کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ماحول سے' گھر والوں تک سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کی یہ تبدیلی گھر میں سبھی نے محسوس کی لیکن کسی نے کچھ پوچھا نہیں۔ کوئی پوچھتا تو بھی کیا فرق پڑتا۔ وہ اس سلسلے میں کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتا تھا۔

پہلے ہی ہفتے میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ہیلن کا عادی ہو چکا ہے۔ اس کی سمجھ میں اس شعر کا مفہوم آ گیا' جس کا وہ ہمیشہ مذاق اڑاتا تھا۔

وہ ترا ساتھ اک گھڑی بھر کا
کیوں ستاتا ہے عادتوں کی طرح

دوسرے ہفتے کے شروع میں یہ حال ہوا کہ اس کے ذہن میں ہر وقت ہیلن کا تصور ہوتا۔ وہ یہ آس لے کر سوتا کہ اسے خواب میں دیکھے گا لیکن وہ عجیب و غریب خواب دیکھتا' اذیت ناک خواب۔ ہیلن اسے کبھی خواب میں نظر نہیں آئی۔ اسے نیند سے خوف آنے لگا۔ نیند اچھی چیز نہیں رہی۔ بار بار آنکھ کھلتی' اس پر وہ اذیت ناک خواب۔

ہر صبح دفتر جاتے ہوئے وہ سوچتا کہ آج ہیلن کو فون کرے گا۔ دفتر میں وہ کش مکش میں مبتلا رہتا۔ اس کا جی چاہتا کہ فون کرے پھر وہ خود کو سمجھاتا کہ فون کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو گیا ہے۔ وہ خود کو یاد دلاتا کہ وہ ایک جنگ لڑ رہا ہے' جس میں اہمیت ضبط اور تحمل کی ہے۔ وہ خود کو روک لیتا۔ اسے وہ جنگ بہرحال جیتنا تھی۔ اس ضبط میں بڑی اذیت تھی۔ اسے خیال آتا کہ ہیلن کی اذیت تو اس سے بھی سوا ہو گی۔ پھر وہ سوچتا کہ کون جانے' وہ بڑے سکون سے ہو۔ سکون سے نہ ہوتی تو فون کر لیتی۔ پھر خیال آتا کہ وہ خود بھی بے سکون ہونے کے باوجود فون نہیں کر رہا ہے۔ اس طرح وہ خود ہی سوال گھڑتا اور خود ہی ان کے جواب۔ نتیجے میں وہ بری طرح جھنجلاتا' خود پر بھی اور ہیلن پر بھی۔ خود پر اس لئے کہ ہیلن سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ اسی نے کیا تھا۔ ہیلن پر اس لئے کہ ایک مہینے کی یہ صوتی اور صوری جدائی اسی نے تھوپی تھی۔ اس عالم میں اسے بھوک لگتی لیکن کھانا نہ کھایا جاتا۔ وہ دو چار لقمے زہر مار کر کے رہ جاتا۔ چائے اور سگریٹ نوشی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھیں۔ ہر نیا دن گزرے ہوئے دن کی تصویر ہوتا تھا۔ بس اذیت کے کسی نئے رنگ کا اضافہ ہو جاتا تھا اس میں۔ وہ ایک ایک دن گن کر کاٹ رہا تھا۔

ایک ماہ پورا ہونے سے ایک دن پہلے ہیڈ کلرک صاحب نے اسے بلایا۔ "تمہارا فون ہے۔" انہوں نے کہا۔

ماجد نے ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو۔" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

دوسری طرف سے صرف بے ترتیب سانسوں کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو۔" اس بار وہ تقریباً چیخ اٹھا۔ ذہن میں اندیشے کلبلانے لگے تھے۔

"ہیلو مجو!" جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"ہاں بول رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے' تم نے فون تو کیا۔"

"بہت ہو چکی مجو! اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔" ہیلن کی آواز لرز رہی تھی۔

"تو نہ کرو۔ میرا بھی برا حال ہے۔ آج ہی آ جاؤ نا۔"

"ہاں' لیکن نہیں۔ جہاں اتنے دن جھیلے ایک دن اور سہی۔"

"بہت ضدی ہو۔"

"نہیں' وعدے کا پاس رکھنا جانتی ہوں۔ خواہ وہ کسی اور سے نہیں' خود سے ہی کیا ہو۔ ہم کل ملیں گے مجو!"

"ٹھیک ہے کل چھٹی کر لو۔ میں تمہارے گھر آ جاؤں گا۔"

"نہیں' نہیں.........." اس کی آواز میں بے تابی تھی۔ "یہ تو کوئی ضبط نہ ہوا۔ نہ تم چھٹی کرو گے نہ میں۔ ہم آفس سے چھٹی کے بعد ملیں گے۔ چھ بجے۔"

"خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو۔" ماجد جھنجھلا گیا۔

"ضد نہیں' وعدے کی بات ہے۔ پلیز مجو! مجھ سے خفا ہو کر بات نہ کرو۔"

"نہیں' میں خفا تو نہیں ہوں۔" ماجد نے جلدی سے کہا۔ "کہاں ملو گی؟"

"وہیں' کیفے اوڈین۔"

"ٹھیک ہے' خدا حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ ماجد نے ریسیور کریڈل پر ڈالا اور اپنی سیٹ پر واپس آ گیا۔ ہیلن کے انداز میں ایک مثبت تبدیلی نظر آئی تھی۔ اس نے گڈ بائی کے بجائے اللہ حافظ کہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ ملاقات بھی یادگار تھی۔ ہیلن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے اور ویٹر کے آنے پر بھی نہیں چھوڑے تھے۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی' جیسے اسے اس کے وجود پر شک ہو۔ ماجد نے ویٹر

کو چائے لانے کی ہدایت کی۔ وہ خفت محسوس کر رہا تھا۔

"کیسی ہو تم؟" اس نے بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو' کیسی ہوں۔" ہیلن نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ماجد نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔ بہت کمزور نظر آ رہی تھی وہ۔ رخسار اندر کو دھنس گئے تھے' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ رنگت دب گئی تھی اور جلد مرجھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک مہینہ اسے چاٹ گیا ہے۔ "یہ کیا حال کر لیا تم نے اپنا؟" ماجد نے پوچھا۔

وہ اب بھی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہی۔ "حال تو تمہارا بھی اچھا نہیں ہے۔" اس نے کمزور آواز میں کہا۔

اتنی دیر میں ویٹر چائے لے آیا۔ ہیلن نے بے تابی سے ٹرے اپنی طرف کھسکا لی۔ "چائے بنانے کو ترس گئی تھی میں۔ سچ پوچھو تو چائے سے نفرت ہو گئی تھی مجھے۔" اس نے کہا اور چائے بنا کر پیالی ماجد کے سامنے رکھ دی۔ "لو' چائے پیو۔"

"تم نے اپنا کیا حشر کر لیا ہے؟" ماجد نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں' چند روز میں ہم دونوں ہی سنبھل جائیں گے۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ نہیں پوچھو گے کہ میں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"بتاؤ۔"

"میرا تلاشِ حق کا جذبہ تمہاری محبت سے ہار گیا۔ مجھے خوشی بھی ہے لیکن میں افسردہ بھی ہوں۔ تمہاری محبت کی یہ فتح مجھے بہت مہنگی پڑی ہے' تم جیت گئے مجو!"

ماجد نہ جانے کیوں شرمسار ہو گیا۔ وہ واقعی جیت گیا تھا' لیکن اسے اس جیت کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ "تو اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں تو اب ذرا سی بھی دیر نہیں چاہتی۔ آج میں مما اور پاپا کو بتا دوں گی۔"

"اور ان کا ردِ عمل کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ تو برسوں سے یہی توقع کر رہے ہیں۔ انہیں دکھ ہو گا لیکن یقین کرو' مجھے نہیں ہو گا۔ البتہ میں ان کا خیال رکھتی رہوں گی۔ تم سے بھی میری یہی التجا ہے۔"

"میں تم سے اس سلسلے میں وعدہ کر چکا ہوں۔"

"تو پھر؟"

"میں آج ہی اباجی سے بات کروں گا' تم کل شام مجھے یہیں ملنا۔"

☆======☆======☆

اباجی نے رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ تقریب کے لئے جمعے کا دن طے پایا۔ ابا کی خواہش تھی کہ قبول اسلام کے بعد ماجد ہیلن کو گھر لائے گا اور وہاں مختصر سی تقریب نکاح ہوگی۔ جس میں محلے کے کچھ لوگ موجود ہوں گے۔ یہ بھی طے پایا کہ لوگوں کو وقت کے وقت مدعو کیا جائے گا۔

اگلی شام ماجد ہیلن سے ملا۔ اس نے ہیلن کو یہ سب کچھ بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں جمعے کے دن اسلام اپنے علاقے کی مسجد میں قبول کروں گی' وہاں سے آنے والی اذان کی آواز برسوں سے میرے وجود میں ہلچل مچاتی رہی ہے۔" ہیلن نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ "تم تین بجے مجھے میرے گھر سے لے لینا۔ اب اس سے پہلے میں تم سے نہیں ملوں گی۔"

"واہ' یہ تو زیادتی ہے۔ آج پیر ہے۔ ابھی تو درمیان میں تین دن پڑے ہیں۔" ماجد نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تین دن صبر نہیں کر سکتے۔ پھر تو میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ چلو تم بھی کیا یاد کرو گی۔"

ہیلن نے باہر نکل کر تنہا گھر جانے پر اصرار کیا۔ یوں وہ جدا ہو گئے' اس یقین کے ساتھ کہ اب وہ شادی کے بعد ملیں گے۔

☆======☆======☆

ان کا یقین سچ ثابت ہوا۔ ان دونوں کی ملاقات شادی کے بعد ہی ہوئی۔ اس شام کے تقریباً بارہ سال بعد۔ اس دوران بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے بالوں میں ہلکی ہلکی سفیدی اتر آئی تھی لیکن ہیلن کے چہرے پر بلا کی معصومیت اور پاکیزگی تھی' جب کہ ماجد کے چہرے پر بے سکونی اور پچھتاوے لکیروں کی تحریر میں لکھے ہوئے تھے۔ ہیلن کے انداز میں ٹھہراؤ تھا' قناعت تھی اور تسلیم تھی۔ ماجد کے انداز میں اضطراب تھا' پریشانی تھی اور شکستگی تھی۔ صرف وہی دونوں نہیں بدلے تھے' دنیا بدل گئی تھی۔ حکومت

بدل گئی تھی۔ نئی حکومت اسلامی نظام کی دعوے دار تھی۔ سود کا نظام ختم کیا جا رہا تھا یا شاید اس کا نام تبدیل کیا جا رہا تھا۔ شرعی عدالتیں قائم کر دی گئی تھیں۔ محکمہ احتساب قائم کر دیا گیا تھا' جس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ ملک میں عیسائی مشنریوں کی کامیابی کے اعداد و شمار ہولناک تھے۔ ان اعداد و شمار کے لحاظ سے ملک سرفہرست تو نہیں' البتہ ایسے نمایاں ملکوں میں تھا' جہاں مسیحیت کامیاب ہو رہی تھی' قبول کی جا رہی تھی۔ ایک خوشگوار تبدیلی بھی تھی۔ بارہ سال پہلے جو شخص.......... خدمت خلق کی غرض سے تنہا میدانِ عمل میں اترا تھا' اب وہ ایک ادارہ تھا۔ اس کا نام تھا عبدالستار ایدھی۔ وہ دکھی انسانیت کی خدمت کر رہا تھا' بے لوث خدمت' وہ تبلیغ نہیں کرتا تھا لیکن تبلیغ سے بہتر نتائج حاصل کرتا تھا۔ دوسری طرف سرکاری سطح پر اسلام اسلام کا شور تھا لیکن لوگ خود کو پنجابی' سندھی' پٹھان بلوچ' مہاجر اور بہاری کہتے تھے۔ اس بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے' خون بہاتے تھے ایک دوسرے کا۔ وہ بڑا پُرآشوب دور تھا۔ ہیلن کی ایک اور پیش گوئی درست ثابت ہو گئی تھی۔ اسلامی نظام کے دور میں بھی عیسائی مشنریوں کو کھلے عام تبلیغ کی اجازت تھی۔ ان کا تبلیغی لٹریچر وبا کی طرح پھیل رہا تھا۔ بارہ سال بعد اس روز ماجد نے ہیلن کو بازار میں دیکھا تو اسے نہ جانے کیا کیا یاد آ گیا۔

وہ اس روز اپنے بیٹے ساجد کو جوتا دلانے نکلا تھا کہ اچانک اسے ہیلن نظر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک بچہ تھا' ساجد کا ہم عمر۔ ماجد ہیلن کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ہیلن نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنے بچے کی انگلی تھامے اس کے قریب آ گئی۔ "السلام علیکم۔" اس نے بڑے تپاک سے کہا۔

"کیا حال ہے ہیلن؟" ماجد نے سلام کا جواب دینے سے گریز کیا۔ جانتا تھا کہ غیر مسلموں کے سلام کا جواب نہیں دیا جاتا۔

"ہیلن نہیں' میرا نام آمنہ ہے۔" تہدیدی لہجے میں جواب ملا۔ "اور یہ میرا بیٹا ہے ماجد۔" اس بار لہجہ فخریہ تھا۔

ماجد سن ہو کر رہ گیا۔ بازار میں زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ وہ لوگ سائیڈ میں کھڑے تھے۔ ننھا ماجد بڑی دلچسپی سے ماجد کو دیکھ رہا تھا۔ ساجد کے انداز میں بے زاری تھی۔ اسے اپنے جوتوں کی فکر تھی۔

“بیٹے ماجد! یہ تمہارے انکل ہیں..........” آمنہ نے ننھے ماجد سے کہا۔

“السلام علیکم انکل!” بچے نے کہا اور ماجد سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

ماجد نے ساجد کو گھور کر دیکھا۔ ساجد نے بڑی بے زاری سے کہا۔ “ہیلو آنٹی۔”

ماجد کٹ کر رہ گیا۔

“انکل کو سارے کلمے سناؤ ماجد!” آمنہ نے اپنے بچے سے کہا۔

بچے نے بڑی روانی کے ساتھ کلمے مع ترجمہ سنا دیئے۔ ماجد کو بچے پر بے ساختہ پیار آیا۔ اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ساجد کو شاید کمتری کا احساس ہوا۔ اس نے آمنہ سے کہا۔ “میں نظمیں سناؤں آنٹی؟”

“ضرور سناؤ بیٹا!” آمنہ نے بڑی شفقت سے کہا۔

ساجد نے بابا بلیک شیپ سمیت تین انگریزی نظمیں فرفر سنا دیں۔ ماجد اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔

آمنہ نے ساجد کی پیشانی چوم لی۔ “ماشاء اللہ‘ ذہین ہو اپنے ابو کی طرح۔” اس نے شاپنگ بیگ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

“امی! اب چلئے نا۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔” ننھے ماجد کے لہجے میں تڑپ تھی۔

“ہاں پاپا! چلئے مجھے جوتے دلایئے۔” ساجد نے ٹھنک کر کہا۔

ماجد اور آمنہ کی نظریں ایک لمحے کے لئے ملیں۔ “آئی ایم سوری۔” ماجد نے زیرلب کہا۔

“سوری کہنے کا تو آپ کو اب بھی کوئی حق نہیں۔” آمنہ نے کہا۔

ساجد تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

“اچھا‘ خدا حافظ۔” آمنہ نے کہا۔

“خدا حافظ انکل! آپ ہمارے گھر آئیں گے نا؟” ننھے ماجد نے کہا۔

“بیٹے‘ ہم نے تو بارہ برس پہلے جنت چھوڑ دی تھی۔ اب ہم کسی جنت میں قدم نہیں رکھ سکتے۔” ماجد نے دل گرفتگی سے کہا۔

آمنہ نے نظریں اٹھا کر ماجد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماجد کو اس کی آنکھوں میں

در گزر کی روشنی نظر آئی۔ اس نے جان لیا کہ آمنہ نے اس کی وجہ سے بڑی اذیت سہی ہے لیکن اسے معاف کر دیا ہے۔

“اچھا‘ خدا حافظ۔” آمنہ نے کہا اور بچے کی انگلی تھام کر آگے بڑھ گئی۔ ماجد انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے لیکن وہ اسی راستے کو تکتا رہا۔

“چلئے نا پاپا!” ساجد نے اسے چونکا دیا۔

اس نے ساجد کو جوتا دلایا اور گھر واپس چلا آیا۔ وہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔ اس نے بیوی سے کوئی بات نہیں کی۔ اپنے کمرے میں چپ چپ لیٹا رہا۔ وہ اس دن کو یاد کر رہا تھا‘ جب اس نے جنت گنوائی تھی۔ اسے مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں قربانی دی تھی‘ اسلام کی خاطر‘ اپنی نسل کی خاطر‘ اس نے اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا تھا‘ شاید اس نے ہیلن کی زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اس لئے کہ اس کے بچے خالص مسلمان ہوں‘ لیکن ہیلن برباد نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو اب آمنہ تھی‘ ننھے ماجد کی امی اور وہ خود اپنے بچوں کا پاپا تھا۔ اس کے بچوں کو صرف ایک کلمہ آتا تھا۔ ہیلن کے بچے کو تمام کلمے یاد تھے معنی سمیت۔ اس کے بچے کو جوتوں کی فکر تھی اور ہیلن کے بچے کو نماز کی۔ یہ سب کیا تھا! کیا اس کی قربانی رائیگاں ہی گئی؟

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا۔ اس نے جمعے کے دن ہیلن سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ جمعرات کی شام وہ دفتر سے آیا تو شمیم کا بلاوا اس کا منتظر تھا۔ وہ چائے پی کر اس طرف چلا گیا۔ وہاں شمیم کے علاوہ ظفر اور مولانا بشیر بھی تھے۔ انہوں نے بڑے پُرتپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔ “فرمایئے‘ خیریت تو ہے؟” اس نے پوچھا۔

“جی ہاں‘ بس آپ سے نجی نوعیت کا ایک سوال کرنا تھا۔” ظفر نے کہا۔

“جی؟”

“سنا ہے کل آپ ایک کرسچن لڑکی سے شادی کر رہے ہیں؟”

“جی ہاں۔” اس نے جواب دیا لیکن اس کا ماتھا ٹھنک گیا۔

“وہ کرسچن لڑکی‘ جو اس علاقے میں تبلیغ کے سلسلے میں آ چکی ہے؟”

“وہ مجبور ہو کر آئی تھی‘ ورنہ اس نے کبھی تبلیغ کے کام میں حصہ نہیں لیا۔”

“یہ تو اس نے آپ کو بتایا ہو گا اور آپ نے یقین کر لیا ہو گا۔ ہم تو یقین نہیں کر

سکتے اس پر۔"

"تو مت کیجئے یقین۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

اس پر ظفر جزبز ہو گیا۔ مولانا بشیر نے بات آگے بڑھائی۔ "دیکھیں ماجد صاحب! میں جانتا ہوں کہ آپ سیدھے سچے مسلمان ہیں' لیکن آپ ایک کرسچن لڑکی سے شادی کر کے اسلام کو نقصان پہنچائیں گے۔"

"وہ کل مسلمان ہو رہی ہے۔"

"یہ بات ناقابل یقین ہے کہ جو لڑکی کل تک مسیحیت کی تبلیغ کرتی رہی ہے' وہ آج مسلمان ہو جائے گی۔"

"اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ آپ کل خود اس سے پوچھ لیجئے گا۔"

"میں سب جانتا ہوں' آپ کو اندازہ نہیں۔ آپ اپنی پوری نسل تباہ کر لیں گے۔ اسلام کو بھی نقصان پہنچے گا۔"

"میں اسلام کو نقصان پہنچانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔ "آپ مجھے سمجھائیں تو۔ آخر اس میں کیا قباحت ہے؟"

"دیکھیے' تاریخ شاہد ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمانوں پر سب سے کاری وار اپنی عورتوں کے ذریعے کیا ہے' ہر دور میں ایسا ہوا ہے۔ اس دور میں مصر کو دیکھ لیجئے۔ لبنان کو دیکھ لیجئے اور نتائج آپ کے سامنے ہیں وہ اپنی عورتوں کے ذریعے مسلمانوں کی نسل تباہ کر دیتے ہیں۔"

"لیکن ہیلن اسلام سے متاثر ہے۔ وہ سچے دل سے اسلام قبول کر رہی ہے۔"

"یہی بات تو حلق سے نہیں اترتی۔ میں نے سنا ہے' اس سے پہلے وہ مسلمان ہونے پر تیار نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔"

"جی ہاں' اس وقت جو بات آپ کہہ رہے ہیں میں نے اسی کے حوالے سے اسے سمجھایا تھا۔"

"وہ مسلمان ہونے پر رضامند کیسے ہوئی؟"

"میری محبت کی وجہ سے۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ اسلام سے متاثر ہے۔ اس لئے مسلمان ہو رہی

ہے۔"

"جی ہاں' دونوں باتیں ہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مشنری کی ہدایت پر مصلحتاً ایسا کر رہی ہو۔ اس صورت میں آپ کے بچوں کا' آپ کی نسل کا کیا ہو گا؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ہاں' یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ ذہن نے سوچا' لیکن دل نے سختی سے تردید کر دی۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں اور آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔ ایسے میں آدمی دماغ سے نہیں' دل سے سوچتا ہے۔"

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"یہ بھی سوچیں کہ علاقے میں آپ کی عزت نہیں رہے گی۔" ظفر نے کہا۔

"مجھے کوئی پروا نہیں' عزت ذلت خدا کے ہاتھ ہے' آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔"

"آپ کو بلیک میل کوئی نہیں کر رہا ہے۔" شمیم نے جلدی سے کہا۔

"سوچیے تو' اس میں آپ کے گھر کے ہر فرد کا نقصان ہے۔ آپ کی بہنوں کا کیا بنے گا؟"

"آپ لوگ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ جھنجلا گیا تھا۔

"اس صورت میں آپ کی بہنوں کو مناسب رشتہ ملنے کا امکان نہیں۔" مولانا بشیر نے کہا۔ "ہمارا خیال ہے کہ وہ کرسچن لڑکی مذموم مقاصد کے تحت اسلام قبول کر کے آپ سے شادی کر رہی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ سچی ہے اور اسلام سے واقعتاً متاثر ہے۔ مان لیں کہ ہم دونوں کے لئے امکانات برابر ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ آپ کا خیال درست ہے' تب تو ٹھیک ہے۔ یہ کارِ ثواب بھی ہے لیکن ہمارا خیال درست ہے تو آپ بڑے خسارے میں ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ آپ اپنے طور پر ذاتی نقصان کی صورت میں ہر خطرہ مول لینے کا حق رکھتے ہیں' لیکن جہاں آپ کی نسلوں کو اور دین کو خطرہ لاحق ہو' وہاں آپ کو خطرہ مول لینے کا حق حاصل نہیں۔ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ ہم تو آپ کے بھلے کے لئے ہی کہہ رہے ہیں۔"

وہ منطقی انداز میں کہی گئی بات تھی' اس کے دل میں اتر گئی۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "ٹھیک ہے' میں غور کروں گا۔"

"ہم بھی آپ پر کوئی فیصلہ نہیں تھوپ رہے بلکہ یہی چاہتے ہیں کہ آپ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ جذباتیت سے بچیں۔"

وہ وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ سوچتا رہا کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ جذباتیت ہی ہے۔ ہیلن بھی یہی کہتی تھی' سب یہی کہتے ہیں۔ شاید وہ کوئی درست فیصلہ کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ وہ سوچتا رہا کہ کس سے مشورہ لے پھر اسے اباجی کا خیال آیا' جو بزرگ ہی نہیں دوست بھی تھے۔

اس رات اس نے اباجی کو سب کچھ بتا دیا۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ مولانا کی بات معقول ہے۔ ممکن ہے لڑکی سچی ہو لیکن یہ امکان بھی ہے کہ وہ منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہی ہو۔ اس طرح وہ محلے والوں میں گھل مل کر اور لوگوں کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔

"فیصلہ تو تمہیں کو کرنا ہے بیٹے!" اباجی نے کہا تھا۔ "لیکن میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے بہرحال تمہارا فیصلہ مجھے منظور ہو گا۔"

یوں اباجی نے اسے آزادی بھی دی اور فیصلہ بھی کر دیا۔ تمام رات اس کے ذہن و دل میں جنگ ہوتی رہی۔ وہ جاگتا رہا۔ بالآخر صبح ہوتے ہوتے دل ہار گیا۔ شاید اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی غیر جذباتی فیصلہ کیا تھا۔ اس کے باوجود الجھتا رہا۔ ہیلن کا چہرہ اس کی نگاہوں میں پھرتا رہا۔ وہ جمعے کا دن تھا اور اس زمانے میں جمعے کی چھٹی نہیں ہوتی تھی' بلکہ ہاف ڈے ہوتا تھا۔ وہ عموماً ہاف ڈے کی چھٹی کرنا چھٹی کا زیاں سمجھتا تھا لیکن اس روز وہ دفتر جانے کی پوزیشن ہی میں نہیں تھا۔ بارہ بجے تک وہ سوچتا رہا' الجھتا رہا اور کڑھتا رہا پھر اسے نیند آ گئی۔ وہ سو کر اٹھا تو پانچ بجے تھے۔ ہیلن نے اس کا کس کس طرح انتظار کیا ہو گا۔ اس کے دل میں کیا کیا وسوسے آئے ہوں گے۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا۔ دل چاہا کہ وہ ہیلن کے گھر جائے لیکن نہ جانے کیوں' خیال آیا تھا کہ وقت نکل چکا ہے۔

اس روز کے بعد بھی اس نے بارہا ہیلن کے گھر جانے کے متعلق سوچا لیکن پشیمانی کا بوجھ دن بہ دن بڑھتا گیا۔ اب وہ اس کا سامنا کر ہی نہیں سکتا تھا پھر اس کی شادی ہو گئی اور آہستہ آہستہ ہیلن کی یاد بھی مٹتی گئی لیکن آج اسے دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ اسے

کبھی نہیں بھولا تھا۔

اب گھر میں کیا تھا۔ ثمینہ اور زرینہ کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دونوں اپنے اپنے گھر میں خوش تھیں۔ امی اور ابا اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ شاہد کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ رہ رہا تھا۔ یہاں وہ تھا' اس کی بیوی اور چار بچے۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ شام ہو گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ یہ شام......... یہ شام تو ہیلن کے نام ہے۔ آمنہ کو وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اب پرائی ہو چکی تھی' کسی اور کی امانت تھی' لیکن ہیلن تو اب بھی اس کی تھی۔ اس نے بیوی سے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے' ممکن ہے' دیر سے واپسی ہو۔ بیوی بڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

وہ بغیر سوچے سمجھے' بغیر سمت کا تعین کئے نکل کھڑا ہوا تھا پھر خودکار سے انداز میں اس کے قدم رک گئے۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا تھا۔ بارہ سال اس نے یہاں آنے سے گریز کیا تھا۔ صرف یہی نہیں' ان بارہ سالوں میں اس نے ایسی ہر جگہ سے گریز کیا تھا' جہاں وہ کبھی ہیلن کے ساتھ گیا تھا۔ ایسی ہر رہگزر اس کے لئے دکھ کی رہگزر تھی۔ زندگی میں یونہی کچھ دکھ کم ہوتے ہیں کہ انسان مزید دکھ خریدے! وہ بچوں کی فرمائش کے باوجود نہ کبھی چڑیا گھر لے کے گیا تھا اور نہ کلفٹن۔ اس کی بیوی اس بات پر جھنجلاتی تھی' کہتی تھی کہ اسے بچوں کا کوئی خیال نہیں ہے' بچوں سے بالکل محبت نہیں ہے۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ ان بچوں کے لئے تو اس نے اپنی سب سے بڑی خوشی قربان کر دی ہے۔ آج شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بچے تو اس کی توقعات پر پورے نہیں اترے۔ اس میں کس کا قصور تھا؟ خود اس کا؟ اس کی بیوی کا؟ درس گاہوں کا یا معاشرے کا' جس نے نئی نسل کو نیم مغربی ماحول دیا تھا اور انہیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا؟

وہ کیفے اوڈین کے سامنے کھڑا ہچکچاتا رہا' لیکن یہ بارہ سال پہلے والی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اب وہ ایک پختہ کار مرد تھا۔ وہ تنہا بھی اوپر جا سکتا تھا۔ فیملی کیبن میں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہیلن نہیں تھی' لیکن جو لوگ اس طرح لٹتے ہیں' ان کے ساتھ بچھڑے ہوئے لوگوں کے آسیب ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر' ان کی آنکھوں میں

آسیبی سائے منڈلاتے ہیں۔ وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ بھرا پُرا ریسٹورنٹ اس کے لئے یادوں کا قبرستان تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اندر قدم رکھتے ہی بے شمار یادیں اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑی ہوں گی، اس کی پذیرائی کے لئے۔ پھر اس نے سوچا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ حسین یادیں دکھ دیں گی، لیکن وہ دکھ بھی حسین ہوں گے۔ وہ اسے خوشی بھی دیں گے۔ ایسی خوشی جو دکھوں میں بھیگی ہوئی ہوگی، لیکن اس خوشی کو وہ بارہ برس سے ترس رہا تھا۔

طبعاً وہ بے حد ذمہ دار آدمی تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ آدمی کی اپنی زندگی صرف شادی تک ہوتی ہے۔ شادی کے بعد اس کی زندگی، اس کا ہر فعل بچوں کی امانت ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ وقت ضائع کر رہا ہے لیکن انسان کو بارہ برس میں چند گھنٹے اپنے لئے بھی ملنے چاہئیں۔ ماضی میں جینے کے لئے کیا وہ ان چند گھنٹوں کا بھی مستحق نہیں۔

وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ وہ اپنے جانے پہچانے فیملی کیبن میں گھسا تو جیسے ایک سایہ اس کے ساتھ تھا، لیکن نہیں، وہ سایہ نہیں تھا، وہ تو ہیلن تھی۔ البتہ اسے صرف وہی دیکھ سکتا تھا اور کسی کو وہ ہرگز نظر نہ آتی۔ یک لخت ہی کسی طلسم نے اسے اسیر کر لیا تھا۔

چند لمحے بعد ویٹر آیا۔ اسے جھٹکا لگا، کیوں کہ وہ اسی پرانے ویٹر کی آمد کی توقع کر رہا تھا لیکن اسے یہ احساس پھر بھی نہیں ہوا کہ وہ بارہ سالوں کے بعد یہاں آیا ہے۔

"آپ اکیلے بیٹھے ہیں صاحب؟" ویٹر نے پوچھا۔

"نہیں، کیا میں تمہیں اکیلا نظر آ رہا ہوں؟"

ویٹر گڑبڑا گیا۔ "میرا مطلب ہے کہ صاحب آپ اکیلے ہیں تو باہر بیٹھ جائیں۔"

"پھر وہی بات، میں یہیں بیٹھوں گا۔" اس نے ترش سے لہجے میں کہا۔ "کیا یہ بات ریسٹورنٹ کے ضابطوں کے خلاف ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے سر! آپ تشریف رکھئے۔ کیا خدمت کروں آپ کی؟"

"دو چائے لے آؤ۔"

ویٹر نے حیرت اور خوف سے اسے دیکھا اور پھر پلٹ گیا۔ کبھی کبھی ریسٹورنٹ میں پاگل بھی تو آ جاتے ہیں۔ اب تو بھگتنا ہی پڑے گا، اس نے دل میں سوچا۔

ماجد سامنے بیٹھی ہیلن کو دیکھتا رہا، جو اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی، لیکن کسی بت کی طرح بے حس و حرکت تھی۔ کچھ دیر بعد ویٹر چائے لے آیا۔ ماجد نے ٹرے ہیلن کی طرف کھسکا دی اور پلٹ کر ویٹر کو دیکھا۔ ویٹر کو اس کی آنکھوں میں آسیبی سایہ نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر وہاں سے کھسک آیا۔

ہیلن نے ٹرے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی ماجد کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"چائے نہیں بناؤ گی؟" ماجد نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں نہ اقرار ابھر سکا نہ انکار۔ وہ بے تاثر نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"مجھ سے بہت ناراض ہو؟"

نہ اس کے ہونٹ ہلے، نہ آنکھیں بولیں، لیکن ماجد نے اس کی آواز صاف سنی۔ "میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی مجو! بس بات اتنی سی ہے کہ تمہاری ایک غلطی سے میں پتھر کی ہوگئی ہوں۔"

ماجد کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ایسی چائے کا کیا فائدہ، جو ہیلن نے نہ بنا کر دی ہو۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو اسے نمی کا احساس ہوا۔

"ارے! میں تو رو رہا ہوں۔" اس نے ہیلن سے کہا۔

"اچھا ہے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ چائے نہیں پیو گے؟" ہیلن کے لب اب بھی ساکت تھے لیکن آواز واضح تھی۔ ماجد کو احساس ہوا کہ وہ آواز باہر سے نہیں، اس کے اندر سے آ رہی ہے۔

"نہیں، اب میں چائے نہیں پیوں گا۔"

وہ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ویٹر بل لے کر آیا تو وہ ہیلن سے کہہ رہا تھا۔ "یہاں سے تمہارے گھر چلیں گے اور پھر کلفٹن، ٹھیک ہے نا؟"

ویٹر کے ہوش اُڑ گئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بل کی طشتری میز پر رکھی اور برتن سمیٹ کر بھاگم بھاگ رخصت ہو گیا۔

ماجد نے طشتری کے نیچے دس کا نوٹ دبایا اور کیبن سے نکل آیا۔

☆======☆======☆

صدر کا علاقہ خاصا تبدیل ہو چکا تھا۔ بیشتر بوسیدہ عمارتوں کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ تاہم کچھ پرانی عمارتیں ابھی باقی تھیں۔ ہیلن والی عمارت بھی ایسی ہی عمارتوں میں سے تھی۔ ہیلن والے فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ ماجد نے دروازے پر دستک دی۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہیلن اب اس کے ساتھ نہیں تھی۔

کچھ دیر میں دروازہ کھلا اور شیلا نظر آئی۔ شیلا کو پہچاننے میں ماجد کو ذرا دشواری نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی پہلے جیسے تھی۔ بس اس کی شادابی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"کون ہے؟" شیلا نے پوچھا اور اسے دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور سنسنی آمیز لہجے میں چیخی۔ "اوہ ماجد بھائی! آئی کانٹ بی لیو مائی آئز.........."

"یہ میں ہی ہوں شیلا۔" ماجد نے کمزور آواز میں کہا۔

"او' پلیز کم ان۔ آئی ایم سو ایکسائیٹڈ ماجد بھائی!"

ماجد اندر چلا گیا۔ ڈرائنگ روم میں سب کچھ پہلے ہی جیسا تھا۔ "آیئے ماجد بھائی! بیٹھیے۔" شیلا نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

ماجد بیٹھ گیا۔ اسی وقت دو بچے کمرے میں آ گئے' ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا ہو بہو شیلا کی تصویر تھا۔ لڑکی کی بڑی بڑی شفاف آنکھیں ہیلن کی یاد دلاتی تھیں۔

"یہ میرے بچے ہیں۔" شیلا نے کہا۔ "یہ ہیلن اور یہ جیکب!" پھر اس نے بچوں سے کہا۔ "یہ تمہارے ماجد انکل ہیں' وش کرو انہیں۔"

"گڈ ایوننگ انکل!" دونوں بچوں نے بیک آواز میں کہا۔

"گڈ ایوننگ۔" ماجد نے جواب دیا۔

"اب جاؤ اور کھیلو۔" شیلا نے دونوں بچوں کو ہدایت دی۔ وہ باہر چلے گئے۔

"ماجد بھائی! چائے لاؤں آپ کے لئے؟" شیلا نے پوچھا۔

"نہیں میں نے چائے چھوڑ دی ہے۔" ماجد نے کہا۔

"اب آپ سنایئے' کہاں غائب رہے؟ ہیلن نے بہت انتظار کیا آپ کا۔"

ماجد نے چونک کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے معلوم ہے بھائی! ہیلن نے سب کو بتا دیا تھا کہ وہ آپ سے شادی کرنے والی ہے۔ لیکن آپ نہیں آئے۔ میں اس سے کہتی رہی کہ فون کر لے' آپ کے گھر جا کے دیکھے' لیکن وہ کہتی تھی کہ مجو کو کچھ ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ ضرور آتا۔ میں فون کر کے یا اس کے گھر جا کر کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتی۔ میں کہتی' ضروری تو نہیں کہ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہو۔ ممکن ہے' کوئی اور بات ہو' اس پر وہ کہتی' یہ اور بری بات ہو گی۔ میں نے اس کی ہر بات مان لی۔ میں لڑکی ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ میری عزت کا اسے خیال کرنا چاہیے۔ اب اسے آنا ہو گا' اسے مجھ سے رابطہ کرنا ہو گا۔ میں ایسا کر سکتی ہوں' وہ اسی دن مسلمان ہو گئی تھی۔ ہم سے لڑتی تھی۔ کہتی تھی کہ خبردار' اب مجھے ہیلن کے نام سے نہ پکارنا۔ میں اب آمنہ ہوں۔ تمارے ساتھ مجبوراً رہ رہی ہوں۔ جس دن میرا مجو آئے گا' میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ وہ ہم سب سے محبت کرتی تھی' لیکن چڑتی بھی تھی۔ مما اور پاپا نے کبھی اس سے سختی سے بات نہیں کی' لیکن مَیری کو اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اس گھر میں تمہاری مقدس کتاب جو پڑھتی تھی' نماز جو پڑھتی تھی۔ وہ دو سال آپ کا انتظار کرتی رہی ماجد بھائی! آخر میں مَیری کا رویہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ ہیلن روتی تھی کہتی تھی کہ میں اکیلی ہوں' الگ مکان لے کر بھی نہیں رہ سکتی۔ مما اور پاپا بھی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ پاپا کہتے تھے کہ میرے نصیب میں بیٹا تھا ہی نہیں۔ دو سال کے بعد ہیلن نے ایک مسلمان سے شادی کر لی۔

"اس کا نام حمید ہے۔ اچھا آدمی ہے وہ' لیکن کبھی آپ کی طرح ہمارے گھر نہیں آیا۔ ہیلن شادی کے بعد بھی سروس کرتی رہی۔ پوری تنخواہ لا کر مما کے ہاتھ پر رکھ دیتی لیکن شادی کے بعد اس نے کبھی ہمارے گھر کا پانی تک نہیں پیا۔ ایک سال بعد مَیری نے بھی شادی کر لی۔ اگلے سال ہی میری بھی شادی ہو گئی۔ میرا ہسبنڈ بھی بہت اچھا ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے ورنہ آپ کو اس سے ملاتی۔"

"مما اور پاپا کہاں ہیں؟" ماجد نے پوچھا۔

"دو سال پہلے وہ چلے گئے' آگے پیچھے۔" شیلا نے اداس لہجے میں بتایا۔ "ماجد بھائی! اس روز آپ کیوں نہیں آئے تھے؟"

"میں مرگیا تھا شیلا!"

"مرگئے تھے!" شیلا نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں مرگیا تھا۔ اتنی حیرت سے نہ دیکھو مجھے۔ کبھی کبھی آدمی مرکر بھی چلتا پھرتا ہے۔ زندہ تو میں اب بھی ہوں۔" ماجد نے جواب دیا۔ اب وہ شیلا کو کیا بتاتا؟

"ماجد بھائی! آئی ایم سوری۔"

"کچھ نہیں ڈیئر' آدمی کا اختیار ہے ہی کتنا۔ وہ بھی کبھی کبھی دوسرے لوگ اور کبھی معاشرہ سلب کرلیتا ہے۔ اب میں چلوں گا۔"

"رکیں نا کچھ دیر۔ کھانا کھا کر جایئے گا۔" شیلا نے اصرار کیا۔

"نہیں میرا جانا بہت ضروری ہے۔" ماجد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شیلا کو نہیں بتایا کہ اسے ہیلن سے ملنا ہے۔

☆======☆======☆

قدم یوں بے اختیاری سے اور اعتماد کے ساتھ اٹھ رہے تھے' جیسے وہ اپنی منزل سے باخبر ہو' حالاں کہ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ پھر وہ چونکا تو اس نے خود کو تانگا اسٹینڈ پر موجود پایا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اسے یاد آیا کہ وہ رمضانی بابا کی تلاش میں آیا ہے۔ وہ رمضانی بابا جسے وہ زندگی میں ایک بار ملا تھا.........

جس کے تانگے پر بیٹھ کر وہ ہیلن کے ساتھ کلفٹن گیا تھا' جس نے واپسی پر اس سے پیسے لینے سے سختی کے ساتھ انکار کر دیا تھا' یہ کہہ کر کہ ہیلن اس کی بچیوں کی طرح ہے۔ ہاں' وہ اس تانگے کو کلفٹن لے جانے کے لئے آیا تھا' جس کی اس نے ایک شام کو چابی بھی کی تھی۔

رمضانی بابا وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے پانچ منٹ انتظار کیا۔ وہ پانچ منٹ اسے ایک صدی کی طرح لگے پھر اس سے صبر نہ ہو سکا۔ اس نے ایک تانگے والے سے رمضانی بابا کے متعلق پوچھا۔

"کون رمضانی بابا!" تانگے والے نے حیرت سے کہا وہ چند لمحے ذہن پر زور دیتا رہا' پھر چونکا۔ "اوہ' وہ رمضانی بابا' اس کا تو سات سال پہلے انتقال ہو گیا تھا بابو!"

ماجد کے دل پر گھونسا سالگا۔ اسے شدید دکھ ہوا تھا یہ سن کر۔ اسے ایسا لگا' جیسے اس

کے اندر ایک عہد مرگیا ہو۔ اف' ایک شخص' جس سے صرف ایک مختصر ملاقات ہوئی' وہ اتنا اہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ گم صم کھڑا رہا۔ تانگے والا کچھ کہہ رہا تھا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ تانگے والا تھک ہار کر خاموش ہو گیا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔

چند لمحے بعد وہ سنبھلا۔ "کہیں چلنا ہے بابو؟" تانگے والے نے پوچھا۔

"ہاں' چلنا تو تھا' لیکن چھوڑو۔" ماجد نے آہستہ سے کہا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ بیتے لمحوں کے قبرستان' سمندر کی طرف جارہا ہے۔ سمندر جو بہت اچھا امانت دار ہوتا ہے۔ جو ہمیشہ لاشیں واپس کر دیتا ہے وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ اتنے تانگوں میں اسے وہی ایک تانگا درکار تھا' جو اب اسے نہیں مل سکتا۔ کھوئی ہوئی تمام چیزوں' گزرے ہوئے لمحوں اور مہربان' محبت کرنے والی پاکیزہ ہیلن کی طرح۔

وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی۔ وہ پچھلی نشست کی طرف بڑھا لیکن ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے اگلا دروازہ کھولا۔ "سوری ڈیئر! اس طرح تو لوگ تمہیں ڈرائیور سمجھیں گے۔" اس نے اگلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور بری طرح گڑبڑا گیا۔ "جی صاحب! میں تو ہوں ہی ٹیکسی ڈرائیور۔"

"ہاں' ٹھیک ہے۔" ماجد نے خالی الذہنی کی سی کیفیت میں کہا۔ "کلفٹن چلو۔"

ڈرائیور چند لمحے اسے حیرت سے دیکھتا رہا' پھر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ ٹیکسی سے اترا اور ساحل کی طرف چلنے لگا۔ وہاں بہت تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ پارک میں بے شمار جھولے نصب تھے۔ مختلف کھیلوں کے درجنوں اسٹال بن گئے تھے۔ وہ بڑھتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے دل کا بوجھ بھی بڑھ رہا تھا۔ اب تو وہ بے حس و بے حرکت ہیلن بھی ساتھ نہیں تھی' جسے اس کی ایک غلطی نے پتھر بنا دیا تھا۔

وہ چلتا رہا' اچانک اسے احساس ہوا کہ جس ریت پر اب وہ چل رہا ہے' وہاں تو بارہ سال پہلے ایک سمندر ہوا کرتا تھا۔ اب سمندر بہت دور تھا۔ ایک دیوار کے پیچھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وقت نے سمندر کو بھی بارہ برس پیچھے دھکیل دیا ہے۔ وہ تانگا لے کر ساحل تک جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اچھا ہوا وہ تانگہ لے کر نہیں آیا۔

وہ دیوار تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سمندر تو دیوار سے بھی خاصا پیچھے ہے۔ اس وقت اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ دیوار پر چڑھا اور پار اتر گیا۔ نیچے ریت بہت سخت تھی۔ سیمنٹ کے فرش کی طرح۔ سمندر خاصا پیچھے تھا لیکن آگے بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک اسے جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہیلن اس کے سامنے تھی۔ وہ بے حس و حرکت تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"سیپیاں چنیں؟" ماجد نے پوچھا۔

ہیلن کے لب نہیں ہلے' آنکھیں نہیں بولیں' لیکن اس کی آواز سنائی دی۔

"ہاں!"

وہ سیپیاں جمع کرتا رہا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ تھک ہار کر کنارے کی طرف چلا آیا۔ موجیں اب مزید پیش قدمی کر رہی تھیں۔ وہ ریت پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ ہیلن اس کے سامنے تھی۔

"ریت پر میرا نام نہیں لکھو گے؟" ہیلن کی آواز سنائی دی۔

"نہیں تمہارا نام ہی ایسا ہے کہ میں ریت پر نہیں لکھ سکتا۔ پھر اب میں فرق سمجھ گیا ہوں۔ نام لکھنے والے خود غرض ہوتے ہیں۔ وہ کسی کا نام لکھتے ہیں تو اپنے لئے۔ گھروندے بنانے والے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ گھروندے اس کے لئے بناتے ہیں' جسے چاہتے ہیں۔ میں تمہارے لئے گھروندا بناؤں گا۔"

"اب نہیں بنا سکتے۔"

"کیوں نہیں بنا سکتا؟"

"دیکھتے نہیں ہو کہ اب ساحل کی ریت پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہے۔ اب تم میرے لئے گھروندا نہیں بنا سکتے مجو!" آواز نے "میرے لئے" پر بالخصوص زور دیا تھا۔

"میں بناؤں گا گھروندا' ضرور بناؤں گا۔" ماجد نے کہا پھر اس نے انگلیوں سے ریت اکھاڑنا شروع کر دی۔ کام واقعی دشوار تھا۔ سمندر کے شور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سورج سمندر میں اترنے والا تھا۔ بالآخر ماجد نے گھروندا بھر ریت جمع کر لی پھر اس نے اپنا پاؤں نیچے رکھا اور اوپر ریت جمانے لگا۔ اسی وقت ایک زور دار موج آئی اور اس نے جمی ہوئی

ریت کو اکھاڑ کر بہا دیا۔ ماجد نے ہیلن کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں ساکت تھیں۔ ماجد نے پھر کوشش کی۔ اس بار قاتل موج پہلے سے زیادہ تند تھی۔ اس کے باوجود وہ کوشش کرتا رہا لیکن ہر بار موجوں نے گھروندے کو ابتدائی مرحلے میں ڈھا دیا پھر اس نے بارھویں کوشش کی۔ نتیجہ اس بار بھی وہی تھا' بلکہ اب تو پانی وہاں تک آ پہنچا تھا' جہاں وہ بیٹھا تھا۔

"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورج غروب ہو چکا ہے۔" ہیلن کی آواز نے کہا۔

ماجد نے نظریں اٹھا کر دیکھا سورج واقعی غروب ہو چکا تھا۔ سمندر رات کی طرح تاریک نظر آ رہا تھا۔ "اب کچھ نہیں ہو سکتا؟" ماجد کے لہجے میں سوال بھی تھا اور مایوسی بھی۔

"ہاں مجو! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے گھروندا بنانے کا وقت گزر چکا ہے۔"

"شعر سنو گی؟"

"سناؤ۔"

"دو شعر سناؤں گا۔" ماجد نے کہا۔

زمیں پر نام میرا روز وہ لکھے محبت سے
ہوا مارے رقابت کے سدا اس کو مٹا جائے
بنائے وہ مری خاطر گھروندا روز ساحل پر
کوئی موجِ سمندر روز ہی اس گھر کو ڈھا جائے

"واہ' بہت خوب بہت اچھے شعر ہیں۔" ہیلن کی آواز نے کہا۔ "غور سے سنو مجو! اب میں جا رہی ہوں۔ تمہیں میری قسم' میرے پیچھے نہ آنا۔ تمہاری زندگی اب تمہارے بچوں کی امانت ہے۔ آج کے بعد میرے بارے میں کبھی نہ سوچنا' یاد رکھنا کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے ان پانیوں میں دفن کر دیا ہے۔"

ہیلن کا رخ ماجد کی طرف تھا اور وہ الٹے قدموں سمندر کی طرف چل رہی تھی۔ ماجد سحر زدہ سا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہیلن اب کمر تک پانی میں تھی۔ پھر وہ اور پیچھے ہٹی۔ اب صرف اس کا چہرہ پانی کے اوپر تھا۔ خود ماجد گھٹنوں گھٹنوں پانی میں تھا۔

"ماجد تمہیں میری قسم واپس چلے جاؤ اور آئندہ یہاں نہ آنا۔ دکھ کی کسی رہگزر پر نہ جانا۔ مجو! مجھے حسرت ہے' کبھی مجھ سے کوئی ایسا وعدہ بھی کر لو' جو پورا کر سکو۔ وعدہ کرو

مجو!" آواز میں التجا تھی۔

ماجد کو شدید جھٹکا سا لگا۔ واقعی اس نے ہیلن سے بہت وعدے کئے تھے' وفا ایک بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں ہیلن! اور یہ وعدہ نبھاؤں گا۔" اس نے چیخ کر کہا۔

"شکریہ مجو! بے حد شکریہ۔" اسی وقت پانی نے ہیلن کا چہرہ بھی نگل لیا۔ ماجد ایک قدم بڑھا' پھر اسے ہیلن سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ اب وہ وعدہ اسے ہمیشہ یاد رکھنا تھا' وفا کرنا تھا۔ وہ پلٹا اور دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ پانی اب دیوار کو چھونے لگا تھا۔

میں نے کہا کہ تم سے بچھڑ کر میں کیا جیوں
اس نے کہا کہ عہد وفا تو وفا کرو

وہ دیوار پھاند کر اوپر آیا اور دوسری طرف اتر گیا۔ وہ اپنی ہیلن کو پانیوں میں دفن کر آیا تھا' سورج کے ساتھ۔ اس کے ذہن میں خیالات کا' سوالات کا ایک ہجوم تھا۔ کچھ بوجھ حکومتوں کے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ حکومتیں وہ بوجھ نہ اٹھائیں تو یہ ان کی نااہلی ہے' لیکن جب وہی بوجھ فرد پر لاد دیا جاتا ہے تو فرد کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہ کیسا ظلم ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا یہ ظلم؟ وہ حکمراں کب آئیں گے' جو زبان سے جو کچھ کہیں گے' اس پر عمل بھی کریں گے؟ لوگ مذہب کے نام پر' معاشرے کے رواج کے نام پر دوسروں کی خوشیوں کو کب تک قتل کرتے رہیں گے؟ دوسروں کی آنکھوں میں تنکے تلاش کرنے والوں کو اپنی آنکھ کے شہتیر کب نظر آئیں گے؟ ان تمام سوالوں کے علاوہ اس کے ذہن میں ایک سوال اور بھی تھا کہ ان تمام سوالوں کے جواب کون دے گا؟

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ روشنیاں دور تھیں' بہت دور۔ وہ تنہائی اور سکون کی تلاش میں بہت دور نکل آیا تھا۔ دور جہاں روشنیاں تھیں' وہیں سے اسے ٹیکسی یا رکشا ملنا تھا۔ اسے وہاں تک پیدل چلنا تھا۔ راستہ بہت طویل اور وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن اسے اپنے وعدے کی لاج رکھنا تھی۔ وہ پہلا اور آخری وعدہ تھا' جسے وہ ہر حال میں وفا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ تھکن کے باوجود چلتا رہا' چلتا گیا۔

☆======☆======☆

زخم نہاں

نفسیاتی الجھنوں کا شکار وہ نوجوان ایسے زخم نہاں کا شکار تھا جو اسے کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ وہ دور سے بلبلا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مسیحائی چاہتا تھا مگر کوئی مسیحا نہ تھا...... اس کے سینے میں ایک صحرا آباد تھا۔

یونیورسٹی کیمپس پولیس اسٹیشن میں وہ کال اتوار کی شام موصول ہوئی۔ اس وقت انسپکٹر منصور ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے فوری طور پر ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور یونیورسٹی کے ہاسٹل کا رخ کیا۔

ہاسٹل کے نگران کا نام جمشید تھا۔ اس نے انسپکٹر کے استفسار پر بتایا۔ "جی ہاں۔ راشد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے کمرے میں کوئی گڑبڑ ہے لیکن اس نے مجھے تفصیل نہیں بتائی۔ نہ ہی کمرے میں جانے دیا۔ کہنے لگا......... یہ پولیس کیس ہے۔ صرف پولیس ہی اندر جا سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ اس نے وہ دن بھی دیکھے تھے جب ہاسٹل میں اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تھا مگر اب تو زمانہ ہی اور تھا۔ ہاسٹل میں اسلحے کی بھرمار تھی۔ لڑکوں کے لبوں پر دھمکیاں ہوتی تھیں۔ وہ کسی کو روک ٹوک نہیں سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ نوکری پر لات مار کر چل دیتا لیکن ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ کر آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔

"اس کمرے میں کون کون رہتا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"راشد نوید' مظفر ملک۔ ہر کمرے میں دو لڑکے ہوتے ہیں۔" جمشید نے جواب دیا۔

"یہ دونوں لڑکے ہیں کیسے؟"

"بہت اچھے۔" جمشید نے جلدی سے کہا۔ "مجھے اسی پر تو حیرت ہے کہ ان کے کمرے میں کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ کبھی کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث نہیں ہوئے۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور پڑھائی کو فل ٹائم جاب سمجھتے ہیں۔ آج سے پہلے راشد نے مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ میرا احترام کرتا تھا۔ اس جیسے چند لڑکوں ہی کی وجہ سے تو میرا بھرم قائم ہے۔" اس کے لہجے میں دکھ اتر آیا تھا۔

"آپ ہمیں ان کے کمرے تک لے چلئے۔"

وہ کمرا دوسری منزل پر تھا۔ دروازہ نیم وا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ انسپکٹر سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جمشید اور پھر ہیڈ کانسٹیبل تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو کرسی پر بیٹھا کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ کرسی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ وہ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ بلب روشن نہ ہونے کی وجہ سے کمرے میں روشنی بہت کم تھی لیکن لڑکے کو اس کی پروا نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ مطالعے میں پوری طرح منہمک تھا۔

انسپکٹر نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک جانب ایک بیڈ تھا اور دوسری جانب دوسرا بیڈ تھا۔ درمیان میں ایک میز اور چار کرسیاں تھیں۔ باقی دو دیواروں کے ساتھ دو رائٹنگ ٹیبلز تھیں۔ سامنے والی دیوار سے لگے ہوئے بیڈ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ کرسی پر بیٹھا ہوا لڑکا اس نیم تاریکی میں بھی خوب روئی کا بھرپور تاثر چھوڑ رہا تھا۔ بلکہ ایسے میں اس کی آنکھوں کی بے پناہ چمک اور نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً دراز قد اور خوش بدن بھی تھا۔ چہرے کے نقوش یونانی مجسموں جیسے تھے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گھنٹوں سے کرسی پر اسی طرح بیٹھا ہے......... ہلا بھی نہیں۔

ان تینوں کے اندر آنے کے بعد لڑکے نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس نے کتاب اپنے سینے پر ٹکائی اور بے نیازی سے سامنے والے بیڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

انسپکٹر بیڈ کی طرف بڑھا لیکن سب کچھ غیر واضح تھا۔

"میرا نام راشد نوید ہے۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے نے بتایا۔

"چکر کیا ہے؟" انسپکٹر نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔ لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جمشید نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی۔

ایک لمحے کو انسپکٹر کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پھر اس نے بیڈ پر لیٹے ہوئے لڑکے کا جائزہ لیا۔ وہ پیٹ کے بل لیٹا تھا۔ پھر انسپکٹر کو اس کے دونوں طرف خون کا تالاب سا نظر آیا......... چہرے کے دونوں طرف' جہاں لڑکے کے ہاتھ رکھے تھے۔ اس کی دونوں کلائیاں کٹی ہوئی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر داہنی سمت پڑا ہوا بلیڈ نظر آیا جس سے...

کنارے سرخ ہو رہے تھے۔

انسپکٹر بھی، جو موت کو ہر روپ میں دیکھ چکا تھا، یہ منظر دیکھ کر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ پھر جیسے اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا لیکن وہاں تو دھڑکن کا کوئی زخمی پرندہ تک نہیں تھا۔ پنجرے میں موت کا سناٹا تھا۔

انسپکٹر کرسی پر بیٹھے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی عمر بیس سال سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ اس نے کتاب سے نظریں بھی نہیں ہٹائیں۔ انسپکٹر کو یہ اداکاری نہیں لگی۔ وہ سفید قمیض اور سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا۔ کمرے کی دیوار پر ٹینس کے کئی ریکٹ لٹکے تھے اور لڑکے کا جسم گواہی دیتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے ٹینس کھیلتا ہے۔

"تو یہ لڑکا مظفر ملک ہے؟" انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔

راشد نے کتاب سے نظریں اٹھائیں اور بولا۔ "جی ہاں۔"

"اس کی عمر؟"

"انیس سال۔"

"لاش پہلی بار تم نے دیکھی؟"

"نہیں، میں نے اسے زندہ دیکھا.......... اور پھر قدم قدم موت کی طرف بڑھتے.......... اور بالآخر ختم ہوتے دیکھا۔"

انسپکٹر گنگ ہو کر اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "کیا مطلب؟"

"میں نے بتایا نا.......... جو کچھ ہوا، میری نظروں کے سامنے ہوا۔" راشد نے جواب دیا۔

"میں دو بجے سے یہاں پر بیٹھا پڑھ رہا ہوں کوئی آدھا گھنٹا پہلے مظفر آیا اور مجھ سے بولا.......... میں خودکشی کر رہا ہوں پھر اس نے ریزر نکالا اور بیڈ پر لیٹ کر پہلے اپنی داہنی اور پھر بائیں کلائی کاٹ ڈالی۔"

"اور تم نے کچھ بھی نہیں کیا! تماشہ دیکھتے رہے؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں ایک لمحے کے لئے اٹھا اور اسے دیکھا۔ وہ کلائیاں کاٹ چکا تھا.......... اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔"

انسپکٹر چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر بولا۔ "کہتے رہو۔"

"پھر اس نے سر اٹھائے بغیر منہ پھیر لیا.......... دیوار کی طرف۔"

"تم نے کیا کیا؟"

"پھر میں پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک باب ختم کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ آپ لوگوں کو مطلع کرنا چاہئے۔ میں نے جمشید صاحب کو تھانے فون کرنے کو کہا۔"

کمرے میں خاموشی تھی۔ تینوں افراد ساکت کھڑے تھے۔ "یعنی وہ یہیں پڑا مرتا رہا.......... اس نے تمہاری موجودگی میں اپنی کلائیاں کاٹیں.......... اور تم بیٹھے پڑھتے رہے؟" انسپکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے اور فیصلے پر عمل کرنے کا حق تھا۔ وہ بھی ہم سب کی طرح ایک آزاد انسان، آزاد شہری تھا۔ پھر نہ وہ چیخا نہ چلایا، نہ اس نے مدد کے لئے کسی کو پکارا۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

اب انسپکٹر اسے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی دیکھ کر راشد خفیف سا مسکرایا۔

"تمہیں یہ لڑکا اچھا لگتا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔ صورت حال اتنی غیر معمولی تھی کہ وہ تفتیش کے روایتی طریقے بھول گیا تھا۔

"جی ہاں۔ بہت زیادہ۔"

"بہت عرصے سے جانتے تھے اسے؟"

"جی ہاں ہم سکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔" راشد نے جواب دیا۔ "ہم اچھے دوست تھے۔ مجھے اس کی موت کا بہت افسوس ہے۔"

اس کا انداز جذبات سے عاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی علمی موضوع پر گفتگو کر رہا ہو۔ اس کی آواز ہموار، لہجہ حقیقت پسندانہ اور بات کرتے ہوئے چہرہ بے تاثر تھا۔ اس کی پوری توجہ اپنی کتاب پر تھی جیسے اس میں سے کچھ پڑھ کر سنا رہا ہو۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

انسپکٹر نے پوچھا۔ "جب اس نے آ کر خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا تو تم نے اس سے کیا

کہا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو کیا تم اس سے ناراض تھے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تم اس سے نفرت کرتے تھے؟ تمہیں وہ برا لگتا تھا؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تم چاہتے تھے کہ وہ مرجائے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو تم نے اسے مرنے سے روکا کیوں نہیں؟" انسپکٹر جھنجلا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"اپنے اوپر سب سے زیادہ حق اس کا ہی تھا۔ میرا نہیں۔"

"میں اپنے آفس جارہا ہوں۔" ہاسٹل انچارج جمشید نے کہا۔ "مجھے وی سی صاحب کو فون کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ فون کر کے سائیکا ٹرسٹ کو بھی طلب کر لیں۔" انسپکٹر نے ہدایت دی۔ پھر راشد سے پوچھا۔ "تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وکیل ہیں۔" راشد نے جواب دیا۔

"اسے تو قتل قرار دیا جانا چاہئے۔" ہیڈ کانسٹیبل نے دبی آواز میں انسپکٹر سے کہا۔

"نہیں۔ قانوناً یہ قتل نہیں ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔ راشد نے یہ بات سن لی تھی.......... اور وہ حیران رہ گیا تھا۔ قتل! اس نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح کا کوئی الزام بھی عائد ہو سکتا ہے۔ اس نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک بدصورت اورافسوس ناک فعل سرزد ہوتے دیکھا تھا.......... اور وہ بھی کسی اور کے ہاتھوں۔ اس نے خود کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس آ گئی۔ راشد ایمبولینس والوں کو اپنے دوست کی لاش اسٹریچر پر رکھ کر لے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ بدستور اسی کرسی پر کتاب ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔

پھر سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر حشمت آ گیا۔ راشد احتراماً اٹھا اور اس نے ڈاکٹر سے ہاتھ

ملایا۔ ڈاکٹر کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی۔ وہ پستہ قد اور فربہ اندام تھا۔ اس کے آنے کے بعد انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے چلے گئے۔

ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد ایک سگریٹ سلگایا۔ اس نے ہاتھ جھٹک کر دیا سلائی بجھائی اور راشد سے پوچھا۔ "یہ مظفر کون تھا؟"

"میرا روم میٹ۔" راشد نے جواب دیا۔

"تمہارا پورا نام کیا ہے؟"

"راشد نوید۔"

"تم مشہور وکیل نوید کے بیٹے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"وہی نا جو لاہور بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

ڈاکٹر حشمت نے میز پر رکھی ایش ٹرے اپنی طرف گھسیٹ لی۔ اس نے ایش ٹرے میں راکھ گراتے ہوئے پوچھا۔ "مظفر ملک نے خودکشی کیوں کی؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اگر تم نے خودکشی کی ہوتی تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟"

راشد نے محسوس کیا کہ وہ سوال بڑی ہوشیاری سے اسے گھیرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس نے مظفر کو خودکشی کیوں کرنے دی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ وہ خاموشی سے ڈاکٹر حشمت کو ایش ٹرے میں راکھ جھاڑتے دیکھتا رہا۔ حالانکہ کافی دیر سے اس نے کش بھی نہیں لیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بس ایش ٹرے بھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر حشمت اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔

"کوئی وجہ نہیں ہوتی۔" بالآخر راشد نے جواب دیا۔ "اور آپ کا سوال خلافِ حقیقت بھی ہے۔ میں نے تو ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔"

"لیکن تم نے اسے خودکشی کرنے دی۔"

"جی ہاں۔"

"کیوں؟"

"کیوں نہ کرنے دیتا۔ وہ سمجھدار تھا' بالغ تھا' اپنا اچھا برا سمجھتا تھا۔ اس نے جو کچھ کیا' وہ حادثے کی طرح نہیں تھا۔ اس نے بالارادہ کیا تھا.........."

ایش ٹرے میں راکھ جھاڑنے کا عمل رک گیا۔ ڈاکٹر حشمت کا ہاتھ ٹھٹکا۔ اس نے راشد کو بغور دیکھا۔ "تم درست کہہ رہے ہو؟ تمہیں اس پر یقین بھی ہے؟"

"جی ہاں میں آزادی رائے اور آزادی عمل پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ آزادی عمل غلط طور پر استعمال کی جائے تو سزا بھی عمل کرنے والے ہی کو ملتی ہے۔ قانون کیوں بنایا گیا ہے.......... آزادی عمل کا ناجائزہ فائدہ اٹھانے والوں کے لئے۔ ورنہ قانون کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

سائیکا ٹرسٹ بیٹھا چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" یہ کہہ کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا پھر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے پلٹ کر راشد کی طرف دیکھا۔ "تم دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ہم بہت اچھے دوست تھے۔"

"اور کچھ؟"

"جی نہیں۔"

ڈاکٹر حشمت واپس آیا۔ اس نے جیب سے ایک ٹیبلٹ نکال کر میز پر رکھ دی۔ "نیند نہ آئے تو اسے پانی سے لے لینا۔"

"آپ کے خیال میں مجھے اس کی ضرورت پڑے گی؟"

"پڑ سکتی ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا۔ دروازے پر ہاسٹل انچارج کھڑا تھا۔ وہ اندر نہیں آیا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے کہا۔ "راشد.......... منگل کے روز تین بجے تمہیں وی سی صاحب سے ملنا ہے۔" پھر وہ ڈاکٹر حشمت کی طرف مڑا۔ "اور آپ کو بھی۔"

"ٹھیک ہے۔" راشد نے کہا۔ ڈاکٹر حشمت نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

راشد جانتا تھا کہ سائیکا ٹرسٹ اب رخصت ہونے والا تھا لیکن وہ اسے رخصت کرنے کے لئے کھڑا نہیں ہوا۔ حالانکہ اس نے اس کا خیرمقدم کھڑے ہو کر کیا تھا لیکن اتنی دیر میں وہ راشد کی نظروں میں بے وقعت ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر حشمت نے اس کی طرف وزٹنگ کارڈ بڑھایا۔ "ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لینا۔ تم مجھ سے بات کر کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کر سکتے ہو۔"

"جی' بہت بہتر۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی وہ اسی کرسی پر بیٹھا رہا۔ وہ کبھی میز پر رکھی اپنی کتاب کو تکتا اور کبھی ایش ٹرے کو.......... اور پاؤں جھلاتا رہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کرسی کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور ذہنی طور پر اپنی چیزوں کو مظفر کی چیزوں سے الگ کرتا رہا۔ کمرا جتنا اس کا تھا اتنا ہی مظفر کا بھی تھا.......... اور اب بھی تھا۔ مینٹل پیس پر چار کیمرے رکھے تھے۔ ایک میز پر بھی تھا۔ وہ پانچوں اس کے تھے۔ ٹینس کے تمام ریکٹ بھی اسی کے تھے۔ دیوار پر لٹکی ہوئی پینٹ' شرٹ اور ٹینس کا نیکر مظفر کا تھا۔ تقریباً آدھی کتابیں بھی مظفر کی تھیں۔ اسے کتابوں کا جائزہ لے کر انہیں الگ الگ بھی کرنا تھا۔

وہ اٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ باہر خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ وہ باہر دیکھتا رہا۔ کیمپس کے درمیان چھوٹی سڑکوں کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ ان کی روشنی دائروں کی شکل میں زمین پر پڑ رہی تھی۔ وہ پلٹا اور کمرے سے نکل کر آفس کی طرف چل دیا۔

آفس میں روشنی تھی۔ جمشید میز کے پیچھے بیٹھا کچھ کاغذات اِدھر اُدھر کر رہا تھا لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کی توجہ کاغذات پر نہیں ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" راشد نے کہا۔ "مجھے ایک فون کرنا ہے۔"

"ضرور.......... ضرور۔" جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم فون کرو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ آفس کا دروازہ لاک کر جانا۔"

اس کے جانے کے بعد راشد نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو اپنا نام اور کمرا نمبر بتانے کے بعد لاہور کا نمبر دیا۔ پھر وہ کال ملنے کے انتظار میں انگلیاں چٹخاتا رہا۔

کچھ دیر بعد گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "لاہور بات کیجئے۔" آپریٹر نے کہا۔ اگلے ہی لمحے ممی کی آواز ابھری۔ "ہیلو.........؟"

"ممی......... میں راشد بول رہا ہوں........."

"میں کھانا کھا رہی ہوں۔ راشد......... کیا تم کھانا نہیں کھاتے؟"

"ممی......... ڈیڈی کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ضروری بات کرنا ہے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ تم پریشان معلوم ہو رہے ہو۔"

"آپ مجھے یہ بتائیں' ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"وہ تو فیصل آباد گئے ہیں۔ بات کیا ہے راشد؟ کوئی پریشانی ہے تمہیں؟" ممی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آپ کسی طرح ان سے رابطہ کر کے کہیں کہ وہ مجھے ہاسٹل فون کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گی لیکن سچ سچ بتاؤ۔ تم کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئے؟"

"آپ بے فکر رہیں۔ بس ان سے میری بات کرا دیں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھا اور دروازہ لاک کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے ایک کیسٹ لگایا اور موسیقی سننے میں منہمک ہو گیا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ "آپ کا فون ہے راشد صاحب۔" رات کے چوکیدار نے کہا۔

وہ پھر آفس میں چلا آیا۔ آفس رات بھر کھلا رہتا تھا۔ صرف رات کا چوکیدار ڈیوٹی پر ہوتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔"

"راشد......... ابھی کچھ دیر پہلے تمہاری ممی نے مجھے فون کر کے بتایا........."

"جی ہاں ڈیڈی۔"

"کیا بات ہے بیٹے؟"

"ڈیڈی......... مظفر نے آج شام خودکشی کر لی۔"

"اوہ......... مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔"

"میں آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ ممکن ہے' عنقریب میں یونیورسٹی چھوڑ دوں۔"

"کیا یہ ضروری ہے بیٹا؟"

"جی ہاں۔ ممکن ہے' مجھے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جائے۔ منگل کو مجھے وائس چانسلر سے ملنا ہے۔"

"کیوں؟ یونیورسٹی سے کیوں خارج کیا جائے گا تمہیں؟"

"اس نے میری موجودگی میں خودکشی کی تھی۔ میں نے وہ پورا منظر دیکھا تھا۔"

"خودکشی کیسے کی اس نے؟"

"بلیڈ سے اپنی کلائیاں کاٹ لی تھیں۔"

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی' پھر اس کے ڈیڈی نے پوچھا۔ "تم کسی قانونی دشواری میں تو نہیں......... میرا مطلب ہے' نظربندی یا قانونی تحویل میں........."

"نہیں۔ ویسے پولیس والوں نے اس بنیاد پر کہ میں اسے خودکشی کرتے دیکھتا رہا' قتلِ عمد کا تذکرہ ضرور کیا تھا........."

"پاگل ہو گئے ہیں......... اور وہ اس بنیاد پر تمہیں گرفتار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو بیٹے......... مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں لیکن میں ہفتے تک گھر واپس آ جاؤں گا۔ دوسری طرف یونیورسٹی والے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' وہ اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ پھر آگے میں دیکھ لوں گا۔"

"بہت بہتر ڈیڈی۔"

"مجھے ظفر کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا بیٹے۔"

"ایک دن سبھی کو جانا ہوتا ہے ڈیڈی۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔ پھر ملاقات ہو گی۔"

وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ کیسٹ بدستور بج رہا تھا۔ اس نے کیسٹ کو ریوائنڈ کیا تا کہ پورا کیسٹ سنا جا سکے.........

☆======☆======☆

راشد کو فوٹوگرافی سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ اس کی واحد تفریح تھی۔ اس عشق کا آغاز اس وقت ہوا' جب اس کی عمر صرف نو سال تھی۔ کسی نے سالگرہ کے موقع پر تحفے میں اسے کیمرہ دیا تھا۔ وہ اس کیمرے پر یوں فدا ہوا جیسے بچے کسی بھی من پسند چیز

پر فدا ہوتے ہیں۔ وہ کیمرا کندھے سے لٹکائے پھرتا.......... اور موقع پا کر بغیر بتائے کسی کی بھی تصویر کھینچ لیتا۔ بعض اوقات وہ ایک دن میں چھ رول تک استعمال کر لیتا۔ اس ابتدائی دور کی بعض تصویریں تو اب تک اس کے پاس محفوظ تھیں۔ ایک تصویر اس کے کتے کی بھی تھی جس میں وہ گھر کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ ایک تصویر ماں کی تھی جو ایک پارٹی کے دوران لی گئی تھی۔

پھر بتدریج اسے اس فن کا شعور آنے لگا۔ اس کی نظر ایک فنکار کی نظر ہو گئی۔ اس کے انداز کی بے پروائی رخصت ہو گئی۔ وہ بہت احتیاط سے تصویریں لینے لگا۔ اس میں تحمل آ گیا۔ وہ مناسب ترین لمحے کا طویل انتظار بھی کر سکتا تھا۔ پہلے وہ کسی منظر کے بارے میں اندازہ لگاتا کہ کسی نہ کسی لمحے وہ قابلِ دید ہو گا.......... اور پھر اس لمحے کا انتظار کرتا۔ پھر اس نے تصویریں خود ہی ڈیویلپ کرنا شروع کر دیں۔ ایک کمرے کو اس نے ڈارک روم بنا لیا۔ پھر رنگین فلموں کا دور آیا.......... اور وہ شوق خود بخود کم ہوتا گیا۔

پھر اس کے جیب خرچ کا بیشتر حصہ اچھے کیمروں اور لینزز کی خریداری پر صرف ہونے لگا۔ اس کی کارکردگی پروفیشنل فوٹوگرافروں سے بہتر ہو گئی۔ وہ کیمرا خریدتا تو اس کے متعلق سب کچھ جاننے کے لئے گھنٹوں دکاندار کا دماغ بھی چاٹتا۔ عام طور پر دکاندار خوش ہوتے۔ اس کے شوق اور صدقِ طلب کو سراہتے۔ کیمروں کے بارے میں اس کی معلومات سے متاثر ہوتے۔

پھر اس کی کھینچی ہوئی تصویریں کوالٹی کے اعتبار سے بہتر ہوتی گئیں۔ چھٹیوں میں اس کا ایک ہی مشغلہ ہوتا۔ وہ کیمرا کندھے سے لٹکاتا اور گھر سے نکل جاتا۔ وہ لوگوں کو بغور دیکھتا.......... اور موقع پا کر تصویر لے لیتا۔ اس کی کھینچی ہوئی کوئی کوئی تصویر تو بے حد آرٹسٹک ہوتی۔ کوئی کرکٹ یا ہاکی میچ ہوتا تو اس کی بن آتی۔ وہ میچ کے علاوہ میچ دیکھنے والوں کا بھی مشاہدہ کرتا اور بعض اوقات کھیل کے میدان کے ایکشن کو نظر انداز کر کے کسی تماشائی کی ایسی تصویر کھینچتا جو یادگار کہلانے کی حقدار ہوتی۔ ایک بار اس کی کھینچی ہوئی ایک تصویر کو ایک روزنامے کے تصویری مقابلے میں انعام بھی ملا تھا۔

وہ اور کیمرا لازم و ملزوم تھے۔ کیمرا لئے بغیر وہ اسکول بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عام سی صورتِ حال میں بھی غیر معمولی تصویر کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ پھر کالج کے

میگزین میں اس کی تصویریں باقاعدگی سے چھپیں۔ وہ کیمرا ہر وقت اس لئے بھی ساتھ رکھتا تھا کہ لوگ اس کے عادی ہو جائیں.......... کیمرا کانشنس نہ رہیں۔ ان کے لئے اس کا کیمرا لباس سے زیادہ اہم نہ رہے۔ اس صورت میں وہ کسی بھی صورت حال میں اپنا فطری ردِعمل ظاہر کر سکیں گے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ ہر وقت تصویر کھینچتا ہو۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا.......... اور جب ہوتا تھا تو وہ بے پناہ مشاہدے اور مہارت کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیمرا اس کے لئے حرفِ اظہار کی طرح تھا۔

چنانچہ اس رات وہ کیمرا کندھے پر ڈال کر چہل قدمی کے لئے نکلا تو کسی نے اس پر خصوصی توجہ نہ دی۔ حالانکہ شام کے وقت جو کچھ ہوا تھا' سب کے علم میں تھا۔ یونیورسٹی اس طرح کے معاملات کو اخبارات کے صفحات سے دور رکھتی تھی کہ یہ اس کی تقدیس کا معاملہ تھا لیکن یونیورسٹی کے اندر خبریں پر لگا کر اڑتی تھیں۔ پھر راشد اور مظفر دونوں یونیورسٹی کے مقبول لڑکوں میں سے تھے۔ فوٹوگرافی کے علاوہ راشد یونیورسٹی کی ٹینس ٹیم کے لئے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتا تھا۔ گزشتہ سال انٹر یونیورسٹی چیمپئن شپ میں کامیابی اسی کی مرہونِ منت تھی۔ مظفر بہت اچھا مقرر تھا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ کوئز کے مقابلوں میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کی مقبولیت میں اس کی خوش مزاجی کا بہت بڑا دخل تھا۔

دونوں کا موازنہ کیا جاتا تو مظفر زیادہ پسندیدہ قرار پاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طلبا کی رائے میں راشد قدرے مغرور اور بد دماغ تھا۔ حالانکہ وہ بس ریزرو رہنے کا قائل تھا۔

مظفر کا تعلق اسلام آباد سے تھا جبکہ راشد لاہور کا تھا۔ مظفر نے ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی تھی۔ وہیں دونوں کا ساتھ ہوا تھا۔ میٹرک کے بعد راشد نے کراچی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو مظفر نے بھی اپنے گھر والوں سے اجازت لے لی اور اب..........

کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ مظفر کی موت کے چند گھنٹے کے بعد ہاسٹل اور کیمپس والوں نے اسے کیمرا لٹکائے چہل قدمی کرتے دیکھا تو انہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

راشد آٹھ بجے کمرے سے نکلا تھا۔ ہاسٹل میس میں کھانے کا وقت ساڑھے سات بجے تھا۔ راشد نے دانستہ ڈائننگ ہال سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی میز کے قریب

کوئی نہیں پھٹکے گا۔ مگر سب اسے عجیب نظروں سے دیکھیں گے.......... جیسے وہ اچانک ہی' بغیر کسی اعلان کے تبدیل ہو گیا ہو.......... اچھوت ہو گیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ ہال میں اس کی موجودگی لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوگی۔ انہیں ایسی باتوں پر اکسائے گی' جن سے وہ گریزاں ہوں گے۔ وہ ایک دوسرے سے گفتگو کے دوران اس معاملے میں اس کے کردار پر تعجب کا اظہار کریں گے اور راشد کو موضوعِ گفتگو بننا سخت ناپسند تھا۔

یونیورسٹی کے باہر جھونپڑی میں ایک ہوٹل تھا جسے لڑکوں نے کیفے ڈی پھونس کا نام دے رکھا تھا۔ وہ جب بھی ڈائننگ ہال میں کھانا نہ کھاتا' کیفے ڈی پھونس کا رخ کرتا۔ ویسے اتوار کی رات وہ ہمیشہ یہی کرتا تھا اور مظفر اس کا ساتھ دیتا تھا اور آج بھی اتوار تھا لیکن مظفر کھانے کی ضرورت سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

کھانے کے بعد اس نے چائے پی اور پیسے ادا کر کے نکل آیا۔

یونیورسٹی میں پہلے چوک کے قریب گرلز ہاسٹل کی طرف سے ثمینہ آتی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکی۔

یہ ایک اور مسئلہ تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا لیکن لوگ اس کی طرف کھنچتے تھے۔ وہ اسے مداخلت تصور کرتا تھا۔ وہ بس میں بھی ایسی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتا تھا جو خالی ہوتی اور اگر کوئی اس کے آس پاس بیٹھتا تو اسے بہت برا لگتا لیکن اس سلسلے میں کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ڈائننگ ہال میں بھی وہ الگ تھلگ بیٹھتا تھا۔ ہال بہت بڑا تھا.......... اور وہ کھانا کھانے ہمیشہ دیر سے جاتا تھا۔ ایسے میں کوئی نہ کوئی خالی میز مل ہی جاتی تھی۔ اس کے باوجود کوئی نہ کوئی اس کی میز پر آ ہی جاتا۔ کبھی کبھی تو بھیڑ ہی لگ جاتی۔ اس کے حوصلہ افزائی نہ کرنے کے باوجود لوگ اس کی طرف بڑھتے۔ اس نے اس سلسلے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا سبب محض اس کی شخصی خوبصورتی ہے۔ بہر حال وہ ناپسندیدگی کے باوجود سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا۔ اس نے کبھی کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہیں کی تھی.......... تجسس نہیں کیا تھا۔ وہ تو اسے گناہ سمجھتا تھا اور اس کا انداز ہر شخص کو تنبیہہ کرتا تھا کہ اس کی زندگی کے بارے میں بھی کوئی تجسس نہ کرے۔ وہ لوگوں سے ملتا تھا تو اپنی شرائط پر۔

اس وقت بھی اسے ثمینہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔ ثمینہ' مظفر

کی پسند تھی۔ مظفر کا ہر انداز اس کی محبت کا غماز تھا۔ ثمینہ بھی اس سے بہت اچھی طرح ملتی تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ مظفر سے محبت نہیں کرتی تھی۔ کبھی یوں بھی ہوتا کہ مظفر فلم دیکھنے جانے کے لئے کہتا تو وہ منع کر دیتی۔ البتہ راشد ساتھ ہوتا تو وہ کبھی منع نہ کرتی۔ حالانکہ راشد کے ساتھ کوئی اور لڑکی ہوتی۔ مظفر اور راشد دونوں کو اس بات پر حیرت ہوتی۔ ایسا لگتا کہ وہ صرف راشد کی قربت میں وقت گذارنے کی خاطر مظفر کو قبول کر رہی ہے۔ مظفر نے کبھی اس پر کوئی منفی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو ثمینہ کی اس کمزوری سے پوری طرح فائدہ اٹھاتا۔ ثمینہ کو کہیں جانے کے لئے رضامند کرنا ہوتا تو وہ راشد کو رضامند کر لیتا۔ یہ سنتے ہی کہ راشد بھی ساتھ ہوگا' ثمینہ فوراً تیار ہو جاتی۔ راشد کو یہ بات عجیب لگتی۔ وہ سوچتا کہ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟

ثمینہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔ "مجھے معلوم تھا تم یہیں ملو گے۔" وہ بولی۔ "عظیم راشد نوید اپنے معمولات تو ترک نہیں کر سکتا۔ خواہ اس کا عزیز ترین دوست فرش پر خون کے تالاب میں نہا کر موت سے ہم کنار ہو چکا ہو۔" اس کا لہجہ زہریلا تھا۔

"وہ فرش پر خون کے تالاب میں نہیں نہایا.........."

"تو پھر؟"

"بیڈ پر۔"

اس نے نفرت آمیز نگاہوں سے راشد کو دیکھا۔ "تم بہت کمینے ہو.......... خبیث ہو۔"

اکا دکا طالبعلم ان کے پاس سے گزرے مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ وہ قدرے تاریکی میں تھے۔ ثمینہ کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"اور تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اس کا.......... اپنے تفریح کے ساتھی کا سوگ منانے کے لئے مٹرگشت؟" راشد نے ہموار لہجے میں کہا۔

"میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ تم قاتل ہو۔"

راشد نے نظریں چرا لیں۔ اس کے لئے ثمینہ کی آنکھوں سے جھانکتی نفرت کا سامنا کرنا ممکن نہیں تھا۔ "مجھے افسوس ہے۔" اس نے کہا۔ "میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تم پر طنز کیا لیکن میں سمجھا تھا' تم مذاق کر رہی ہو۔"

"تم ناقابلِ برداشت' ناقابلِ فہم آدمی ہو راشد۔"

"اور میں بھول گیا تھا کہ جذبات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔ ویسے یہ بتا دوں' مظفر اس لئے مرا کہ وہ مرنا چاہتا تھا۔"

"مجھے امید ہے کہ تم بھی اسی طرح مرنا چاہو گے۔"

راشد نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا لیکن وہ اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جذبات سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ بحث کا کیا سوال ہے!

"تم خود کو سمجھتے کیا ہو راشد؟" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"معلوم نہیں۔"

"تمہارے گلے میں اس وقت بھی کیمرا جھول رہا ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے کلائیاں کاٹتے ہوئے بھی اس کی کوئی تصویر لی یا نہیں۔ خون کے تالاب کو.......... اور اس کی بے نور آنکھوں کو بھی سیلولائیڈ پر منتقل کیا یا نہیں؟"

راشد نے ایک نظر اپنے کیمرے میں ڈالی اور بولا۔ "نہیں۔"

"مجھے شدید حیرت ہے کہ تم نے مرتے وقت اس کے چہرے پر فلش لائٹ مار کر اسے چونکایا بھی نہیں۔"

"فلش لائٹ نہیں .... فلش بلب کہو۔" راشد نے تصحیح کی۔

ثمینہ پر اچانک جنون طاری ہو گیا۔ اس نے اس کے کندھوں پر گھونسوں کی بارش کر دی پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"آئی ایم سوری ثمینہ۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا شاید؟" راشد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"لعنت ہو تم پر۔ تم بے حس آدمی ہو پتھر۔ جانتے ہو' اس کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے میں نے اس کی محبت قبول نہیں کی۔ اگر تمہارا یہ روپ میں پہلے دیکھ لیتی تو کبھی ایسا نہ کرتی اور اب دیکھ لیا ہے تو کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ تم نے اسے قتل اور مجھے زندہ درگور کر دیا ہے۔ بے رحم آدمی۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اندھا دھند گرلز ہاسٹل کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ "میں تم سے نفرت کرتی ہوں!" اس نے ایک بار پلٹ کر

حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

راشد کا ذہن الجھتا رہا۔ کیا ثمینہ بھی.......... شاید وہ بھی مظفر سے محبت کرتی تھی.......... اور اپنی محبت سے خود بھی بے خبر تھی۔ کیا پتا.......... وہ ان دونوں کی دوستی سے چڑتی ہو۔ محبت میں لڑکیاں عجیب و غریب ہو جاتی ہیں۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا تو اس نے ثمینہ میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی' نہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اس نے تو کبھی ثمینہ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ اسے تو متعارف بھی مظفر نے کرایا تھا.......... اور وہ اسے مظفر کی محبت کی حیثیت سے جانتا بھی تھا۔ اور کچھ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ دوست کی محبت پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے ثمینہ کی وحشت' اس کے جذبات کی شدت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

پھر اسے مظفر کے گھر والوں کا خیال آ گیا۔ اس کے متعلق ان کے جذبات یقیناً اس سے بھی زیادہ شدید ہوں گے۔ انہیں اکلوتے بیٹے کی موت پر کس قدر صدمہ ہو گا۔ کیسا شاک پہنچے گا۔ اس کا اندازہ تھا کہ مظفر کے والدین نے موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اپنی اولاد کو کس طرح آزادی دی ہو گی لیکن اب وہ اپنے بیٹے کے پیرایہ اظہار پر کس قدر شرمندہ ہوں گے۔ کتنے دکھی ہوں گے کہ مظفر نے آزادی کا غلط استعمال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظفر نے جو کچھ کیا' اس کے لئے وہ آزاد تھا مگر راشد زندگی اور اس سے متعلق حقائق کا بڑی بے رحمی سے تجزیہ کرنے کا قائل تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مظفر کے والدین کے لئے وہ ہمدردی محسوس کرتا ہے.......... یا وہ ہمدردی کے مستحق بھی ہیں۔

پہلے اسے خیال آیا کہ اسے مظفر کی تدفین میں شریک ہونا چاہئے۔ آخر وہ لڑکپن کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ ان کی دلچسپیاں اور پریشانیاں مشترک رہی تھیں۔ ان کے مضامین ایک تھے۔ وہ ہر موضوع پر گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے بہترین دوست کی تدفین میں شریک ہو لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ مظفر کے والدین اس موقع پر اس کی موجودگی پسند نہیں کریں گے۔ یونیورسٹی والوں نے تمام حقائق ان کے گوش گزار کر دیئے ہوں گے۔ ان کے نزدیک بھی مظفر کی موت کا

ذمے دار وہی ہوگا۔ ان کا ردِعمل خالصتاً جذباتی ہوگا۔ اس کی تدفین میں شرکت ان کے لئے نفرت انگیز ہوگی۔

تدفین میں شرکت نہ کرنا اس کے لئے کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس نے خود کو ہمیشہ جذبات سے دور اور محفوظ رکھا تھا۔ آدمی مرجائے تو پھراس کے تعلق کے حوالے سے کسی چیز کی اہمیت نہیں رہتی۔ راشد کا کم از کم یہی خیال تھا۔

☆======☆======☆

اگلے روز راشد کو کلاس اٹینڈ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ اپنے ہم جماعتوں سے منہ چھپا رہا تھا۔ وہ تو خود ان کی بہتری کی خاطران سے گریزاں تھا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی موجودگی ان کے لئے پریشانی اور خجالت کا باعث ہوگی۔ وہ عادتاً لوگوں کے جذبات سے خود کو دور رکھتا تھا۔ چنانچہ اس روز وہ کوئی پیریڈ لینے کے بجائے مظفر کا سامان سمیٹنے میں لگا رہا۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ مظفر کے بستر کی خون آلود چادر جلا دی۔ یہ کام وہ گزشتہ رات ہی کر دیتا مگراس وقت تک خون سوکھا نہیں تھا۔ چادر سے نمٹنے کے بعد اس نے مظفر کے کپڑے، کتابیں اور دیگر چیزیں یکجا کر کے ایک ٹرنک میں رکھ دیں۔ پھراس نے چپراسی کو بلا کر ٹرنک نیچے اسٹور میں بھجوا دیا۔

یہ کام نمٹانا اس کی ذمے داری تھی۔ ایسے المناک موقعوں پر یہ کام مرنے والے کے روم میٹ کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ یہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ یہ کام لواحقین نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بے چارے تو وہاں آنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ خاص طور پر خودکشی کی صورت میں۔ شدید دکھ کے راستوں سے ہر شخص کتراتا ہے۔ وہ تو کبھی سامان واپس لینے بھی نہیں آتے۔

میز کی درازیں خالی کرنے کے دوران میں راشد کو ایک تصویر ملی۔ اس نے تصویر کو بغور دیکھا۔ یہ تصویر وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ مظفر کی بہن سمیرا کی تصویر تھی۔ تصویر زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن اس سے انداز ہوتا تھا کہ سمیرا بہت حسین لڑکی ہے۔ اس کے انداز میں خود اعتمادی تھی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔

مظفر اور راشد ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن راشد سمیرا سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اس بات کی اہمیت کا راشد کو پہلے کبھی احساس نہیں ہوا لیکن اب سمیرا کی تصویر پر

نگاہیں جمائے وہ اسی سلسلے میں سوچ رہا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران نہ اسکول میں، نہ کالج میں، نہ یونیورسٹی میں.......... اس کے گھر سے کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ موسم گرما کی چھٹیاں مظفر زیادہ تر اس کے ساتھ ہی گزارتا۔ گھر وہ کم ہی جاتا۔ اس نے چھٹیاں گزارنے کے لئے راشد کو کبھی اپنے گھر مدعو بھی نہیں کیا تھا۔

راشد کو مظفر کے گھر والوں کے متعلق علم صرف ان کے خطوط سے ہوتا تھا جو مظفر کو کبھی کبھار موصول ہوتے تھے۔ کبھی کوئی عید کارڈ یا سالگرہ کے موقع پر مبارک باد کا کارڈ بھی موصول ہوتا۔ کبھی کبھی کوئی فون کال بھی آتی لیکن مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ اصرار کرنے پر وہ اپنے گھر والوں کے متعلق زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ البتہ اصرار کرنے پر وہ اپنے گھر والوں کے متعلق تھوڑی بہت گفتگو کر لیتا۔

مظفر کا باپ آرکیٹکٹ تھا۔ رہائش اسلام آباد میں تھی۔ ایک بنگلا مری میں بھی تھا۔ سمیرا مظفر سے ایک سال چھوٹی تھی۔ وہ بھی تعلیم کے سلسلے میں گھر سے دور رہتی تھی۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اپنی نجی زندگی کے یہ تھوڑے سے حقائق وہ اس طرح بیان کرتا جیسے کسی فائل سے پڑھ کر سنا رہا ہو۔ کچھ عرصے بعد راشد نے اپنے تجسس پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مظفر اپنے گھر والوں کے متعلق زیادہ جانتا نہیں ہے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں ان سے دور تھا.......... اور وہ لوگ خود زیادہ تر سفر میں رہتے تھے.......... کبھی یہاں، کبھی وہاں۔ ٹک کر بیٹھنا تو جیسے انہیں آتا ہی نہیں تھا۔

راشد مظفر کی تدفین میں شرکت کے لئے تو نہیں جا رہا تھا مگر وہ اس کے گھر والوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی متجسس تھا۔ اس کے دل میں سمیرا سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ سمیرا کی تصویر مظفر کے سامان کی وہ واحد چیز تھی جو اس نے ٹرنک میں نہیں رکھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ٹرنک تا ابد اسٹور میں پڑا رہے گا۔ کوئی اسے کھول کر دیکھے گا بھی نہیں۔

☆======☆======☆

منگل کی صبح وہ ٹینس کورٹ کی طرف نکل گیا اور پریکٹس کی غرض سے ایک لڑکے

کے ساتھ تین سیٹ کھیلے۔ وہ سنگلز کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کی سروس بہت تیز اور صاف تھی اور ریٹرن وہ بہت بے رحمی سے دیتا تھا۔ یونیورسٹی کے دوسرے کھلاڑیوں میں اور اس میں نمایاں فرق تھا کہ اسے کوئی ہلا نہیں سکتا تھا اور وہ اعصاب زدہ کبھی نہیں ہوتا تھا' کبھی دباؤ میں نہیں کھیلتا تھا۔ یوں اسے اپنے ہر حریف پر فوقیت حاصل ہوتی تھی......... اور زیادہ تر اس کے حصے میں فتح ہی آتی تھی۔ سنگلز اسے پسند بھی تھا اور اس کے مزاج کے عین مطابق بھی۔ اس میں ساری ذمے داری اس کی ہوتی تھی......... اور سامنے صرف ایک حریف ہوتا تھا۔ اسے ٹیم گیم اچھے نہیں لگتے تھے۔ چند تجربات کے بعد وہ ٹیم گیمز سے متنفر ہی ہوگیا۔ ٹیم کی صورت میں تمام کھلاڑیوں کے درمیان ایک ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی تھی جس کا پیدا ہونا بے حد مشکل تھا۔ کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی سے کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی تھی۔ جس سے کھیل کی خوبصورتی متاثر ہوتی۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ ٹینس پر مرکوز ہوگئی تھی۔ وہ ٹینس نہ تو خوشی کے لئے کھیلتا تھا اور نہ ہی کسی کو شکست دینے کے لئے۔ وہ تو بس اس کے لئے ایک جسمانی ورزش تھی۔ اسے ہار جیت سے بھی کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ بے داغ کھیل کھیلنے کا قائل تھا......... عیوب سے پاک' صاف ستھرا اور خوبصورت کھیل۔

شام تین بجے اسے وائس چانسلر سے ملنا تھا۔ وائس چانسلر کے کمرے میں وائس چانسلر کے علاوہ ہاسٹل انچارج اور ماہر نفسیات ڈاکٹر حشمت موجود تھے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے سب کے انداز میں سرد مہری محسوس ہوئی۔ وائس چانسلر نے اسے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کی میز پر کاغذات کا ڈھیر تھا۔

"بیٹھ جاؤ راشد۔" بالآخر وائس چانسلر نے کہا۔

لیکن راشد کھڑا رہا۔ اس نے کہا۔ "میں پہلے آپ کو یہ بتا دوں کہ میں جلد از جلد یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے ڈیڈی کو بھی مطلع کر دیا ہے......... اور اس سلسلے میں تحریری اطلاع نامہ میری جیب میں موجود ہے۔"

وائس چانسلر نے پہلی بار نظریں اٹھائیں اور اسے تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ راشد کی آواز اور لہجے میں نہ سرکشی تھی' نہ بدتمیزی اور نہ ہی مایوسی اور سوگواری۔ اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ "تم نے یہ کیوں کہا کہ پہلے آپ کو یہ بتا دوں؟" وائس چانسلر نے

راشد سے پوچھا۔

"آپ کو زحمت سے بچانے کے لئے۔" راشد کا لہجہ اب بھی بے تاثر تھا۔

"جو کچھ ہم کہنے والے ہیں' تم اس سے خوفزدہ ہو؟" ڈاکٹر حشمت نے پوچھا۔

"نہیں۔"

ان تینوں نے اسے بغور دیکھا......... اور جان لیا کہ اس نے پوری سچائی سے جواب دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

"آپ کیا کہتے ہیں' کیا سوچتے ہیں' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" راشد نے مزید کہا۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ "یہ بات نہیں کہ میں آپ کا احترام نہیں کرتا۔ میری صاف گوئی کو بدتمیزی نہ سمجھئے گا۔" وہ تینوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ راشد نے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔ مجھ پر قتلِ عمد کا الزام تو نہیں عائد کیا گیا؟"

"نہیں۔" وائس چانسلر نے کہا۔ "میں نے ایس پی سے بات کی تھی۔ تم پر کوئی الزام نہیں۔ دراصل تمہارا جرم قانونی نہیں' اخلاقی ہے۔"

پھر اس نے راشد کا ردِعمل دیکھنے کے لئے اسے بغور دیکھا لیکن راشد کا چہرہ بے تاثر تھا۔ "ایک بات بتاؤ راشد۔ تم یونیورسٹی کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟" وائس چانسلر نے پوچھا۔

راشد نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حشمت کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب یونیورسٹی میں رہا تو اس کی نجی زندگی میں لڑکے ایسے مداخلت کریں گے جیسے ایک دیوار گر جانے سے گھر راہگزر ہو جاتا ہے۔ "میں اب یہاں خود کو کبھی آزاد محسوس نہیں کر سکوں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں یہ خدشہ ہے کہ ہم تمہیں یونیورسٹی سے نکال دیں گے؟"

"میں نے ایسا سوچا ضرور ہے۔"

وائس چانسلر نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر پھیلا کر ان پر نظریں جما دیں۔ "ہم لڑکوں کو اس خطا کی بنیاد پر یونیورسٹی سے نکالنے کے قائل نہیں جسے ہم خود بھی سمجھ نہ سکیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "سچ تو یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تم نے ایسا کیوں

کیا۔ درحقیقت،ہم اس سلسلے میں نفسیات کی مدد سے جاننا.......... سمجھنا چاہتے ہیں لیکن تم ہم سے دور ہو کے خود کو ہماری مدد سے محروم کر رہے ہو۔"

"میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔" راشد نے اپنی جیب سے درخواست نکال کے وی سی کے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر رکھ دی۔ وہ جانتا تھا کہ کاغذات کا وہ ڈھیر بھی اس سے متعلق ہے۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے وی سی کو دیکھا جیسے اجازت کا خواہاں ہو۔

وائس چانسلر نے ایک آہ بھری' سر اٹھا کے راشد کو دیکھا۔ پھر اس نے جو کچھ کہا' اس نے راشد کو حیران کر دیا۔ "خدا تمہاری مدد کرے راشد۔ میری دعائیں' میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"شکریہ۔"

☆======☆======☆

جمعرات کی صبح تک وہ روانگی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ماں کو فون پر بتا دیا تھا کہ وہ کس گاڑی سے آ رہا ہے۔ چنانچہ عمردراز گاڑی لئے اسٹیشن پر اس کا منتظر تھا۔ اس نے راشد کا سامان ڈکی میں رکھا۔ "کہو عمردراز.......... تمہارا کیا حال ہے؟ اور ہاجرہ خالہ کیسی ہیں؟" راشد نے پوچھا۔

"ہم ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم اپنی سناؤ ماسٹر۔"

عمردراز بہت پرانا ملازم تھا۔ ہاجرہ اس سے بھی پہلے کی تھی۔ عمردراز نے ان کے ہاں ملازمت کے دوسرے ہی سال ہاجرہ سے شادی کر لی تھی۔ دونوں بے حد مستعد اور نفاست پسند تھے۔ اسی لئے راشد انہیں بہت پسند کرتا تھا۔ دوسری طرف وہ دونوں بھی راشد کو پسند کرتے تھے.......... اور شاید اس کی وجہ بھی وہی صفات تھیں۔ وہ اس کی تنہائی پسندی سے بھی واقف تھے.......... اور شاید اس کا سبب بھی جانتے تھے۔ گھر میں پارٹیاں کثرت سے ہوتی تھیں۔ ایسے میں ہاجرہ خاموشی سے راشد کا کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیتی تھی۔

"وہ تمہارا دوست کہاں ہے.......... مظفر؟" عمردراز نے اچانک پوچھا۔

راشد نے اندازہ لگایا کہ عمردراز حقائق سے بے خبر ہے۔ اس پر اسے حیرت ہوئی۔

کیونکہ عام طور پر ملازمین سے گھر کی کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ تو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اِدھر اُدھر کی سن کر.......... کاغذ کا کوئی پرزہ دیکھ کر سب کچھ جان لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ مظفر کی موت نے ہر شخص کو دہلا دیا ہے کہ کوئی اس کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ عمردراز کو معلوم نہ ہونے کا کوئی جواز نہیں۔ وہ تو گھر کے فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہرحال راشد نے سوچا کہ حقیقت بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ "مظفر کا تو انتقال ہوگیا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

عمردراز کو جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے پر حیرت.......... اور پھر دکھ کا تاثر ابھرا۔ راشد کو اندازہ نہیں تھا کہ عمردراز ظفر کو اتنا زیادہ پسند کرتا ہوگا۔ تاہم عمردراز کے ردِعمل سے اسے خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ عمردراز کو تفتیش کی عادت نہیں ہے۔

گاڑی راشد ہی نے ڈرائیور کی۔ وہ گھر آتا تو اپنا ڈرائیونگ کا شوق ضرور پورا کرتا تھا۔

☆======☆======☆

اپنے کمرے میں پہنچ کر راشد کو اچانک چکر سے آئے۔ وہ اس کے لئے عجیب سا تجربہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ در و دیوار اسے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں.......... اور اس کا جسم مزاحمت کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جی متلانے لگا۔ اسے ایسے لگا جیسے ابھی قے ہو جائے گی۔ اس نے اپنا منہ سختی سے بھینچا اور گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ اس نے بہت پہلے جان لیا تھا کہ سانسیں ہموار کر لی جائیں تو جذبات پر فتح پائی جا سکتی ہے.......... آدمی خود کو رونے سے بھی باز رکھ سکتا ہے۔ اس بار بھی سانسوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کا جسم.......... اور جسم کے عضلات پُرسکون ہو گئے۔ البتہ پیٹ میں گڑبڑ کا احساس بدستور تھا۔ وہ ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ گزشتہ چند روز کے دوران وہ کھانے کے معاملے میں بہت بے پرواہ ہو گیا تھا۔

مگر پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فلم سی چلنے لگی۔ وہ کبھی تصوراتی نہیں رہا تھا۔ اس نے خود کو تصوراتی بننے بھی نہیں دیا تھا۔ وہ فوٹوگرافر تھا۔ جو کچھ حقیقت میں نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا' اسے صرف وہی دکھائی بھی دیتا تھا۔ فوٹوگرافی کی طرف اس کے جھکاؤ کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس کی آنکھ ایک فوٹوگرافر کی تربیت یافتہ آنکھ تھی۔ وہ ان

چہروں کو نہیں دیکھتی تھی جو اس کے سامنے نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اس لمحے وہ انہونی ہو رہی تھی.......... اور وہ کوشش کے باوجود اسے روک نہیں پا رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے اپنا پرانا کتا نظر آیا۔ وہ کتا جو مرگیا تھا۔ پھر اسے ماں کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بانہیں پھیلائے جیسے کسی کا استقبال کر رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ پھر وہی منظر مختلف مقامات کے پس منظر میں اسے نظر آیا۔ کبھی گھر کا ڈرائنگ روم کبھی ممی کا بیڈ روم' کبھی کسی کے گھر ہونے والی کوئی پارٹی.......... اور ممی جسے ریسیو کر رہی تھیں' وہ فریم سے باہر تھا لیکن راشد جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ البتہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر اسے مظفر دکھائی دیا۔ وہ آہستہ آہستہ سر گھما کر اس سے منہ پھیر رہا تھا.......... دیوار کی طرف رخ کر رہا تھا۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھوں کا تاثر اسے بے حد واضح طور پر نظر آیا۔ وہ آنکھیں کسی زخمی جانور کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ وہ آہستہ سے گھومتا ہوا سر' دیوار کی طرف مڑتا ہوا.......... پھر وہ عکس تسلسل کے ساتھ بار بار اسے نظر آتا رہا۔ جیسے ہر بار کوئی اسے ریوائنڈ کر رہا ہو۔ راشد کوشش کے باوجود اس خیال سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ ان آنکھوں میں اذیت ہے.......... شکایت ہے۔ وہ آنکھیں اسے الزام دے رہی تھیں۔ پھر اسے روتی ہوئی ثمینہ کا چہرہ یاد آیا۔ اس کی آنکھوں سے بے پناہ نفرت جھانک رہی تھی۔ ایک بار پھر مظفر کی نگاہیں ابھریں.......... اور اس کے بعد جیسے ہر منظر صاف ہو گیا۔

عمر دراز اس کی یہ کیفیت بغور دیکھ رہا تھا' بولا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ چہرہ بالکل سفید ہوگیا ہے۔"

راشد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے معلوم تھا کہ عمر دراز اب مزید کچھ نہیں پوچھے گا۔

☆======☆======☆

نوید حسن کا مختصر سا گھرانا مثالی خوش حال گھرانا تھا۔ وہ بہت نامور وکیل تھا.......... انکم ٹیکس سپیشلسٹ۔ اس کی پریکٹس بہت کامیاب تھی اور وہ بہت معروف آدمی تھا۔ وکالت کے علاوہ اس نے کچھ اچھی کمپنیوں میں سرمایہ کاری بھی کر رکھی تھی۔ چنانچہ آمدنی

بے حد و حساب تھی۔ ہن کا ویسے بھی یہ مزاج ہے کہ برستا ہے تو ٹوٹ کر برستا ہے۔

راشد جانتا تھا کہ رات کا کھانا اسے اپنے کمرے میں نہیں ملے گا بلکہ اسے نیچے جانا پڑے گا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ اپنے گھر واپسی کی پہلی رات اسے کھانا ڈرائنگ روم ہال میں ہی کھانا پڑتا۔

وہ نہا کر باتھ روم سے نکلا تو عمر دراز کو کمرے میں موجود پایا۔ "تمہیں کھانے پر بلایا جا رہا ہے۔" اس نے راشد سے کہا۔

"کون کون ہے؟"

"بیگم صاحبہ اور سلمان صاحب۔" عمر دراز نے جواب دیا۔ "کہو تو جا کر منع کر دوں اور تمہارا کھانا اوپر بھجوا دوں۔" اس کے لہجے میں شفقت اور تفہیم تھی۔

"نہیں۔ پہلی رات تو مجبوری ہے۔"

"تو پھر چلے آؤ۔"

راشد نے شلوار کرتا پہنا اور نچلی منزل کی طرف چل دیا۔ ڈائننگ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام سنا تو اندر جانے کے بجائے دروازے پر ہی رک گیا۔ وقت نے اسے ایسے موقعوں پر دروازوں سے کان لگانا سکھا دیا تھا۔

"راشد نیچے آنے ہی والا ہے۔" اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ "تم مائنڈ تو نہیں کرو گے؟"

"میں کیوں مائنڈ کرنے لگا۔" یہ سلمان کی آواز تھی۔

"راشد کا ستارہ جدی ہے۔ کہیں یہ سب کچھ اسی وجہ سے تو نہیں۔ سردیوں میں پیدا ہونے والے بچے سرد مہر ہوتے ہوں گے۔"

راشد پلٹا اور اسٹڈی میں چلا گیا۔ ڈیڈی کی میز کی دراز سے سگریٹ نکال کر اس نے سلگائی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار ہی سگریٹ پیتا تھا۔

ممی اور سلمان کا تعلق گزشتہ آٹھ سال سے اس کے علم میں تھا۔ پہلی بار جب اس نے انہیں دیکھا تھا تو دھک سے رہ گیا تھا۔ اس روز دنیا کا سب سے قابل احترام رشتہ اس کی نظروں میں حقیر ہو گیا تھا لیکن جیسے اس کے سوا کسی کو اس بات کی پروا ہی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بھی بے پروا ہو گیا۔ ممی اکثر سلمان کے ساتھ باہر بھی جاتی تھیں۔

سلمان ایک بینک کا نائب صدر تھا۔ ڈیڈی کی اس سے دوستی تھی۔ وہ اسے کافی حد تک پسند کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کلب کے ممبر تھے......... اور اسکوائش بھی ساتھ ہی کھیلتے تھے۔ اسے تو ایسا لگتا کہ ڈیڈی بھی سب کچھ جانتے ہیں لیکن ان کے اور سلمان کے درمیان کوئی مفاہمت موجود ہے۔ ممکن ہے' گھر میں کبھی کوئی جذباتی بحران آیا ہو اور انہوں نے سکون سے بیٹھ کر کوئی تصفیہ کر لیا ہو گا۔ جو کچھ بھی رہا ہو' سامنے کبھی کچھ نہیں آیا تھا۔

تصفیہ تو خود راشد نے بھی کر لیا تھا۔ پہلی آگہی کی اذیت اسے اب بھی یاد تھی۔ اس وقت اسے لگتا تھا کہ وہ اذیت اسے مار ڈالے گی اور اسی وقت اسے اندازہ ہوا کہ جذبات بڑی سفاک شے ہوتے ہیں......... دو دھاری تلوار کی طرح۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ جذبات کے ہاتھوں ہی مرے گا۔ چنانچہ بقا کے لئے ضروری تھا کہ جذبات سے اپنا ناتہ توڑ لیا جائے۔ خود کو کبھی کسی جذبے میں ملوث ہی نہ کیا جائے۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ سلمان نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ سے راشد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی حد تک نشے میں ہے۔ ممی نے اٹھ کر یوں بانہیں پھیلائیں' جیسے اس سے بانہوں میں سما جانے کی توقع کر رہی ہوں۔

"واہ......... میرا راشد ہمیشہ کی طرح خوبصورت لگ رہا ہے۔"

اس نے ممی کی پیشانی پر پیار کیا۔ "میری ممی۔"

وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ممی کا استقبال کرنے کا وہ انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہ کسی کا بھی خیرمقدم کرتیں' اسی انداز میں کرتیں۔ وہ راشد ہوتا' سلمان ہوتا' ڈیڈی ہوتے یا کوئی اور۔ ان کا اسٹائل یہی رہتا۔ چہرے کا تاثر تک نہ بدلتا۔

"کہو راشد......... ٹینس کیسی جا رہی ہے؟" سلمان نے پوچھا۔

"بہت اچھی۔" راشد نے جواب دیا اور پھر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہارے ڈیڈی کل شام کی فلائٹ سے واپس آ رہے ہیں۔"

راشد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سلمان......... راشد کتنا ہینڈسم ہے' ہے نا؟" ممی نے کہا۔ "تم نے اتنا ہینڈسم لڑکا کبھی دیکھا ہے؟"

راشد کو اندازہ تھا کہ وہ دونوں کچھ پریشان ہیں۔ سلمان کچھ نشے میں تھا۔ اس وجہ سے اس کی بے چینی عیاں تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو صفیہ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمہارا بیٹا کہاں سے ہے......... کیسے ہے!" سلمان نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ یہ میرا بیٹا ہے۔ اتنا خوبصورت' اتنا پرفیکٹ بیٹا بھی کسی ماں کا ہو سکتا ہے......... سوائے میرے؟"

"پرفیکٹ......... اونہہ!" سلمان کا لہجہ خراب ہو گیا۔

راشد کو اندازہ ہو گیا کہ سلمان کو کوئی چیز کاٹ رہی ہے......... کوئی انجانا جذبہ' کوئی دلی تکلیف......... کچھ نہ کچھ تھا ضرور۔

"یہ لڑکا محبت کے قابل نہیں ہے۔" سلمان نے مزید کہا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"دیکھو صفیہ' تم میں گرم جوشی ہے......... دردمندی ہے......... زندگی ہے۔ تم ایسے سرد مزاج' پتھر جیسے بیٹے کی ماں نہیں ہو سکتیں۔ یہ تمہارا بیٹا نہیں ہو سکتا۔"

"بس کرو سلمان۔ راشد بہت خراب وقت گزار کے آیا ہے......... اور یہ گھر میں اس کی پہلی رات ہے۔"

سلمان' راشد کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا گھر میں بند کسی جانور کو دیکھ رہا ہو۔ جواب میں راشد بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

"ایک بات بتاؤ راشد۔" بالآخر سلمان نے پوچھا۔ "تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟"

راشد نے سرتاپا اس کا جائزہ لیا۔ "نہیں۔ میرا خیال ہے' مجھے ممی سے محبت نہیں۔"

"اوہ......... میرے خدا!" سلمان نے کہا۔

"آپ نے سوال کیا' میں نے جواب دے دیا۔"

راشد کبھی ایک بار پہلے بھی ممی سے اپنے تعلق کا تجزیہ کر چکا تھا۔ اس نے دو طرفہ دلچسپی کا تجزیہ کیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی حقیقی اور پائیدار جذبہ نہیں تھا۔ اس نے جو جواب دیا تھا' وہ سچا تھا۔ اگرچہ اسے بدتمیزی پر محمول کیا جا سکتا تھا اور وہ طبعاً بدتمیز نہیں تھا۔ وہ ہرگز حقیقت اس طرح نہ اگلتا۔ اس کا کریڈٹ سلمان کو جاتا تھا جس نے اس طرح بلا واسطہ سوال کیا تھا۔ حالانکہ اسے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ویسے وہ اس کے علاوہ کوئی جواب دیتا تو وہ ممی کے لئے بھی حیران کن ہوتا۔

"تم قاتل ہو.......... خونی ہو۔" سلمان غرایا۔ پھر وہ خاصی کوشش کے بعد کرسی سے اٹھا۔ "صفیہ نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم نے یونیورسٹی میں کیا گل کھلایا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے دھچکا پہنچا ہے یہ جان کر۔"

"ممی آزاد ہیں۔ جسے چاہیں بتا دیں۔" راشد نے سرد لہجے میں کہا۔ اسے یہ سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ سلمان کے خیال میں اس کے محسوسات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔

"سلمان.......... تم نشے میں ہو۔ مجھے تم کو یہ بات نہیں بتانا چاہئے تھی۔" ممی نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"میں نشے میں نہیں ہوں۔ مجھے تکلیف ہوئی ہے۔" سلمان نے کہا۔ "تم جیسی عورت کا بیٹا اتنا سفاک.......... اتنا سرد مزاج.......... اتنا بے تعلق کیسے ہو سکتا ہے۔ راشد.......... مجھے بتاؤ' تم اپنی ماں سے محبت نہیں کرتے؟"

"نہیں.......... ذرا بھی نہیں۔" سلمان نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائیں۔

"آپ کے نزدیک یہ سب کچھ بے حد ذاتی ہے؟ آپ کا اس سے تعلق ہے؟" راشد نے پوچھا۔

سلمان پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا.......... ڈھیر ہو گیا۔ "راشد.......... میرے نزدیک تم بیٹوں کی طرح ہو۔" اس نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

راشد نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ سلمان کے اپنے بھی دو بیٹے تھے.......... اور وہ ہمیشہ اس کی توجہ سے محروم رہے تھے۔ ایسے میں پرائے بیٹوں کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں۔ "تم نے جو کچھ کیا' ناقابل معافی ہے۔" سلمان نے کہا۔

"تم نے اپنے دوست کو خود اس کے ہاتھوں مرنے دیا۔ میرے نزدیک تم انسان ہی نہیں رہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" راشد نے بے پروائی سے کہا۔

"مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم اپنی ماں سے محبت کرتے ہو؟ زیادہ نہیں' کم سہی۔ بہت تھوڑی.......... برائے نام سہی۔"

"مسٹر سلمان' اگر مجھے اپنی ممی سے برائے نام بھی محبت ہوتی تو تم اب سے آٹھ سال پہلے میرے ہاتھوں مر چکے ہوتے۔" راشد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

سلمان کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ الفاظ تھے یا بم کا دھماکا' لیکن صفیہ حسن کا چہرہ بے تاثر تھا۔ سلمان نے بڑی کوشش کے بعد خود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "صفیہ.......... مائنڈ نہ کرنا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں کھانے پر تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے سلمان۔ بہتر بھی یہی ہے۔"

"مجھے افسوس ہے راشد' میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکا۔ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکا۔" سلمان نے جاتے ہوئے کہا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ راشد نے سلمان کو بے اعتمادی کا شکار دیکھا ورنہ اس گھر میں اس کا رویہ مالکانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔ دعوتوں کے دوران میں ایسا لگتا کہ میزبان وہ ہے۔ مہمانوں کے مذاق پر ہنستا' ان کی خاطر تواضع کرتا۔

وہ سوچتا رہا۔ صفیہ بھی خاموش تھی۔ پھر ہاجرہ نے کھانا میز پر لگا دیا۔

☆======☆======☆

کھانے کے بعد ہاجرہ فروٹ لے آئی۔ صفیہ نے راشد سے پوچھا۔ "بیٹے.......... خدا پر تمہارا ایمان ہے؟"

"ہاں' ہے۔ میرا خیال ہے' انسان کو ایمان سے محروم نہیں ہونا چاہئے اور اس کا کوئی متبادل بھی نہیں ہوتا۔"

"مولانا نصیر یاد ہے تمہیں؟"

راشد کو مولانا نصیر یاد تھے۔ ان کا ایک مدرسہ تھا۔ جہاں بچوں کو.......... لڑکوں کو

دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ممی اور ڈیڈی وقتاً فوقتاً مدرسے کی مالی امداد کے ذریعے اپنی اپنی عاقبت سنوارتے تھے۔ اس طرح ٹیکس کے سلسلے میں بھی بچت ہو جاتی تھی۔ راشد کو باپ کی شخصیت کا یہ پہلو بہت برا لگتا تھا۔ خالص کاروباری ذہن.......... منافع کی اتنی زیادہ اہمیت۔ اسے لگتا تھا کہ ڈیڈی نے کسی کاروباری مصلحت ہی کی وجہ سے ممی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اسی لئے انہوں نے سلمان سے بھی ایک طرح کا ذہنی سمجھوتا کر رکھا ہے۔

"جی ہاں.......... یاد ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمہیں ان سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے' وہ تمہاری مدد کر سکیں گے۔"

"ممکن ہے۔"

☆======☆======☆

کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کی غرض سے نکل آیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جب وہ گھر سے نکل رہا تھا تو ممی اسے چھوڑنے دروازے تک آئی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر نکلنے لگا تو بولیں۔ "ممی کو پپی نہیں کرو گے؟"

اس نے بڑی سعادت مندی سے جھک کر ان کی پیشانی چوم لی۔ ممی نے اس کا سر اپنے کندھے سے ٹکا لیا اور بولیں۔ "تم مجھ سے محبت کرو یا نہ کرو راشد میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" پھر ان کے لہجے میں حسرت اتر آئی۔ "راشد.......... تم مجھ سے ذرا سی محبت بھی نہیں کر سکتے؟"

اس نے نرمی سے خود کو چھڑا لیا۔ "تکلیف وہ باتیں مت پوچھا کریں ممی۔"

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ سارہ کے گھر کی طرف نکل آیا ہے۔ سارہ اسی علاقے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتی تھی۔ وہ ہیروئن بننے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر لاہور چلی آئی تھی۔ فلموں میں اسے چند چھوٹے موٹے رول ملے مگر وہ اپنے مزاج کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ البتہ ماڈلنگ میں وہ کامیاب رہی۔ وہ بہت حسین اور متناسب الاعضاء لڑکی تھی۔ جب وہ پہلی بار ملے تو سارہ نے اپنے تمام دکھ اسے سنا ڈالے تھے۔ وہ بے حد متلون مزاج بھی تھی۔ ایک دن کچھ بننا چاہتی اور دوسرے دن

کچھ۔ اس کے اندر بڑی ہی بے یقینی تھی۔ راشد کو اس کا منہ پھٹ ہونا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بہت صاف گو تھی۔

اس وقت شاید اسے سارہ کی ضرورت تھی۔ تنہائی بہت زیادہ کھل رہی تھی۔

اس نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ سارہ نے پوچھا۔ "کون ہے؟" مگر جواب کا انتظار کئے بغیر ہی دروازہ کھول دیا۔ راشد کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔ "ارے.......... یہ تم ہو راشد۔ کب آئے تم؟"

"آج ہی آیا ہوں۔" راشد نے جواب دیا۔

وہ اسے اندر لے آئی۔ اس کے بیٹھنے کے بعد وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں۔ میری ضرورت ہی تمہیں یہاں تک لے آئی ہے۔"

"ٹھیک سمجھیں۔"

وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ "کچھ پیو گے؟"

"ہاں۔ چائے پلا دو۔"

وہ اس کے لئے چائے بنا لائی۔ پھر قریب بیٹھ کر اسے چائے پیتے دیکھتی رہی۔ "مجھے تمہاری آمد سے خوشی ہوئی۔ تم بہت خوبصورت آدمی ہو.......... اور میں خوبصورتی کو ترس رہی ہوں کب سے۔"

"اچھا؟" راشد نے پیالی خالی کر کے میز پر رکھ دی۔

"روشنی بری لگ رہی ہے نا؟" سارہ نے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔

وہ سارہ کے پاس بارہا آ چکا تھا۔ اس تعلق کی سب سے بڑی خوبی اسے یہ لگتی تھی کہ اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک حقیقت پسندانہ تعلق تھا.......... ضرورت کا تعلق۔ البتہ سارہ جو جذبات شامل کرتی تھی' وہ اوپری ہوتے تھے.......... اور یہ اس کے بزنس کا تقاضا تھا۔ اس لئے وہ جذبات راشد کو برے نہیں لگتے تھے۔ البتہ ایک بات وہ سچائی سے کہتی تھی.......... وہ یہ کہ وہ اتنے لوگوں سے ملی ہے مگر آج تک اسے راشد سے اچھا کوئی نہیں ملا۔ راشد جانتا تھا کہ سارہ اس سے ڈرتی بھی ہے۔ شاید اس کی مردانہ وجاہت سے۔ مرد اگر اپنی کیفیات میں مکمل ہو تو عورت اس سے از خود ڈرنے لگتی

ہے۔ سارہ بھی راشد سے ڈرتی تھی۔

"راشد.......... کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں سوچتا کب ہوں۔ سوچنے والا آدمی ہی نہیں ہوں میں۔"

"میں تمہیں سکون دے سکتی ہوں؟" سارہ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"میں پُرسکون ہوں۔"

سارہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار کو چھوا۔ "راشد.......... تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟"

"نہیں۔"

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

راشد کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "میرا خیال ہے' نہیں۔"

"لیکن انسان محبت کے بغیر زندہ نہیں رہتا۔"

"مجھے تو محبت ایک فضول سی چیز لگتی ہے۔"

"تم سے محبت کرنا ایک لاحاصل عمل ہے۔" سارہ جھنجلا گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جھنجلائی تھی۔

"آئی ایم سوری۔" راشد نے کہا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہاری قربت مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"لیکن تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں؟" سارہ نے پوچھا۔ وہ اس کے جواب کی منتظر تھی لیکن جواب نہیں ملنا تھا۔

"راشد.......... ایک نہ ایک دن تم کسی سے شادی کرو گے۔" تھک ہار کر وہ ہی بولی۔

"کیوں کروں گا؟"

"کیونکہ سب کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ مگر تم اپنی بیوی سے محبت نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ محبت تمہارے خمیر ہی میں نہیں ہے۔ بہرحال.......... کبھی نہ کبھی کوئی لڑکی تمہاری طرف بڑھے گی۔ تم سے کہے گی کہ تم اس سے شادی کر لو۔ تو پہلے میں ہی کیوں نہ کہہ دوں۔" سارہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھ سے شادی کر لو راشد پلیز..........

پلیز.......... پلیز.........."

"تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اس لئے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن ہر لمحہ میرے دل سے تمہارے لئے دعا نکلتی ہے۔ یہ وہ انسانی جذبہ ہے راشد جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے؟"

راشد چند لمحے سوچتا رہا' پھر بولا۔ "نہیں' میں نہیں سمجھ سکتا۔" سارہ نے اپنا چہرہ تکئے میں چھپا لیا۔ راشد کھڑا ہو گیا۔ "سنو سارہ' محبت ایک بہت بڑی کمزوری ہے۔ محبت میں آدمی اپنے لئے دُکھنے کا.......... چوٹ کھانے کا سامان کرتا ہے۔"

"کیسی چوٹ؟ کیسا دکھ؟" سارہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "اوہ راشد.......... تمہیں محبت نے بہت دکھ پہنچائے ہیں؟ بہت زخم دیئے ہیں۔" اس نے راشد کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

راشد تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ "مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے محبت کبھی دکھ نہیں دے سکتی۔ اس لئے کہ میں نے یہ راز پہلے ہی جان لیا تھا۔ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں۔ دکھ کیا ملتا۔"

"تم جا رہے ہو؟" سارہ نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔ جانا تو ہے!"

"پھر آؤ گے؟" سارہ کے لہجے میں خوف تھا۔

"ضرور۔" راشد نے ہموار لہجے میں کہا۔ "گڈ نائٹ۔" پھر وہ فلیٹ سے نکل آیا۔

☆======☆======☆

صبح ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی میز پر موجود تھا۔ وہ ایک غیر تحریری ضابطہ تھا۔ کھانا ساتھ کھایا جائے یا نہ کھایا جائے' ناشتا بہرحال ساتھ کیا جاتا تھا.......... ٹھیک آٹھ بجے۔ ناشتے کی میز پر خاموشی رہی۔ ممی اس سے نظریں چراتی رہیں۔

ناشتے کے بعد اس نے پرس جیب میں ڈالا اور ٹہلتا ہوا اس پیٹ شاپ کی طرف چلا دیا جو گھر سے کچھ دور تھی۔ سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں ٹفن کیریئر بھی تھے ہر شخص جلدی میں معلوم ہوتا تھا لیکن راشد کو ہر چہرہ نقاب جیسا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مضامین میں نفسیات کا انتخاب اسی لئے کیا تھا کہ وہ نقابوں کے پیچھے چھپے اصل چہرے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے چہرے دیکھنے میں بڑی دلچسپی تھی۔

پیٹ شاپ میں زیادہ تر پرندے تھے لیکن ایک کینل میں اچھی نسل کے چھوٹے چھوٹے پلے بھی تھے۔ وہ بہت صحت مند لگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں چمکیلی تھیں۔ اس نے شاپ کے مالک سے بات کی اور پلّوں کو بغور دیکھتا رہا۔ ایک کوکر اسپینیل اسے بہت اچھا لگا۔ وہ تین ماہ کا رہا ہوگا۔ اس کی براؤن آنکھوں سے ذہانت ہویدا تھی اور وہ کھلنڈرا بھی معلوم ہو رہا تھا۔ شاپ کے مالک نے اسے یقین دلایا کہ اس کا انتخاب بہترین ہے۔

اس نے قیمت ادا کی۔ دکاندار نے پٹا اور زنجیر تحفتاً پیش کی۔ شاید پلے کی قیمت اس نے زیادہ ہی وصول کرلی تھی لیکن پلے کو پٹا پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بھرپور مزاحمت کی لیکن بالآخر راشد اسے باندھنے میں کامیاب ہوگیا۔

جیسے ہی وہ پلے کو لے کر سڑک پر آیا' پلا بری طرح خوفزدہ ہوگیا اور اکڑ کر بیٹھ گیا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سڑک پر چلا تھا۔ بھیڑ بھاڑ اور ٹریفک کا شور اس کے لئے باعثِ

دہشت ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے قریب سے گزرتی ہوئی ٹانگوں اور پیروں کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتا اور سمٹ جاتا۔ راشد نے اس عالم میں اس کی چند تصویریں لیں۔ پلا دکان میں واپس جانے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس کے خود چلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ راشد کو اسے گھسیٹ کر گھر تک لے جانا پڑا۔

راشد کو مدتوں سے ایک اچھا کتا پالنے کی آرزو تھی۔ پچھلے کتے کی موت کے بعد سے یہ تڑپ اس کے اندر موجود تھی۔ پچھلے کتے اور اس کے درمیان محبت اور اعتبار کا ایک عجیب تعلق موجود تھا جس سے وہ کتے کی موت کے بعد محروم ہوگیا تھا۔ اسے وہ تعلق بے حد عجیب لگتا لیکن وہ کوشش کے باوجود کبھی اسے جھٹک نہیں سکا.......... اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ یہ خیال برسوں اس کے ذہن سے چپکا رہا۔ وہ اپنی جذباتیت پر خود بھی ہنستا.......... اس کا مذاق اڑاتا لیکن اس سے فرق کچھ بھی نہیں پڑتا۔ کتے کی موت کے فوراً بعد اس نے یہ وتیرہ بنا لیا کہ بڑی بہادری اور بے رحمی سے کتے کی موت کو مزاحیہ پیرائے میں بیان کرتا لیکن اس کے اندر کی فضا پر جو سوگ طاری تھا' اس کی سنگینی کم نہ ہوئی۔ وہ ایک اور کتے کی آرزو کرنے لگا۔

اس نے اپنی اس کمزوری کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اداسی جو کتے کی موت کا نتیجہ تھی' برسوں بعد بھی قائم رہی اور وہ بھی تجزیئے کی کوشش میں لگا رہا۔ وہ ہر جذباتی تعلق کو اپنے ذہن میں واضح دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان کوئی گڑبڑ.......... کوئی فرق ضرور ہے۔ کتے کی محبت پر وہ اعتبار کر سکتا تھا۔ وہ کئی بار یہ بات کہہ چکا تھا کہ وہ انسانوں پر جانوروں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اس کا تجزیہ بھی کیا۔ درحقیقت کتا اس کی محبت سے بے نیاز تھا۔ وہ کوئی مطالبہ نہیں کرتا تھا۔ وہ راشد کے آگے پیچھے پھرتا۔ اچھل کر اس کی گود میں چڑھ جاتا۔ وہ زبان سے اس کا جسم چاٹتا۔ کتے نے کبھی اپنی محبت اس سے چھپائی نہیں تھی۔ نہ کبھی اسے اس پر غصہ آیا تھا نہ اس نے کبھی اس سے نفرت کی تھی.......... اور نہ ہی کبھی منہ پھیرا تھا۔ اس نے کبھی بے وفائی بھی نہیں کی تھی۔ وہ غیر مشروط طور پر اس کا وفادار تھا.......... اور اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں سرد مہری تھی نہ دوری' نہ کوئی اذیت۔ کبھی کبھی وہ اسے زیادہ توجہ اور محبت دے کر بگاڑ دیتا مگر ذرا سی دیر میں وہ بگاڑ دور ہو جاتا۔ ایک ملی سی

ڈپٹ........ یا ہلکا سا دھپ اسے سیدھا کر دیتا۔ کتا پھر محتاط ہو جاتا لوگوں سے محبت میں یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ گھر پہنچا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ وہ کتے کو اپنے کمرے میں لے گیا اور فوراً ہی اس کی تربیت شروع کر دی۔ اس نے کتے کا نام ٹامی رکھا۔ واپس آتے ہوئے اس نے بسکٹ کا ایک ڈبا اور گوشت خریدا تھا۔ اوپر آنے سے پہلے اس نے گوشت ہاجرہ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے ابال دے۔

پہلے اس نے پلے سے سخت گفتگو کی' ڈانٹا۔ پھر اخبار کا رول بنا کر اس کی ہلکی ہلکی پٹائی کی۔ وہ کتے کو نروس کرنا چاہتا تھا........ اور ذرا ہی دیر میں وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ٹامی خوفزدہ ہوا تو اس کے اندر اپنے آقا کو خوش کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب بس اس کی رہنمائی باقی تھی۔ ٹامی اس کے اشاروں کے مطابق ردِ عمل ظاہر کرنے لگا۔ جلد ہی وہ اپنے نام سے آشنا ہو گیا۔

شام تک وہ تربیتی کورس چلتا رہا۔ راشد نے ٹامی کو ساکٹ میں سے پلگ نکالنا سکھا دیا۔ راشد انعام کے طور پر اسے بسکٹ یا ابلے ہوئے گوشت کی ایک بوٹی دیتا۔ ایسے میں ننھا پلا اسے ممنونیت اور محبت سے دیکھتا۔ اس کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

شام تک ٹامی نے سیکھ لیا کہ آقا کو کس طرح خوش کیا........ اور خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کس طرح انعام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب وہ احکامات کو سمجھنے اور ان کے مطابق ردِ عمل ظاہر کرنے کا اہل ہو گیا تھا۔ شروع میں پلا "ٹامی" اور "بیٹھو" میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ مگر رول کئے ہوئے اخبار کی چند ضربوں نے وہ کنفیوژن بھی دور کر دیا۔ شام تک ٹامی تھک گیا........ اور اونگھنے لگا۔

ساڑھے پانچ بجے ہاجرہ چائے اور بسکٹ لے آئی۔ اس رات بھی گھر میں دعوت تھی۔ ممی نے اسے بتا دیا۔ حسبِ معمول اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں کھائے گا۔ ممی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ زیادہ مطمئن نظر آنے لگی تھیں۔

دعوتوں کا یہ سلسلہ تو مدت سے چل رہا تھا اور وہ لڑکپن ہی سے ان سے گریزاں رہا۔ اسے لوگوں میں گھلنا ملنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ تقریباً تمام لوگ اوپری دل سے ملتے تھے

اور سطحی گفتگو کرتے تھے۔ دعوت میں شریک ہونے کا جواز سب کے پاس موجود تھا اور عموماً وہ جواز کاروباری ہوتا۔ ایسی دعوتوں میں تعلقات بنتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کرتے........ اور کہیں نہ کہیں خود بھی استعمال ہو جاتے تھے۔

راشد کو معلوم تھا کہ آج کی دعوت میں ڈیڈی شریک نہیں ہوں گے۔ میزبانی کے فرائض سلمان اور ممی مل کر انجام دیں گے۔ ڈیڈی کو ساڑھے نو بجے کی فلائیٹ سے آنا تھا۔ گویا گھر پہنچتے پہنچتے انہیں دس بج جاتے۔ بشرطیکہ فلائٹ وقت پر پہنچتی' جس کا امکان کم ہی تھا۔

راشد نے کھانا اپنے کمرے میں ہی کھایا۔ پھر وہ موسیقی کا کیسٹ لگا کر سنتا رہا۔ اس کے بعد وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ پھوار اب بھی پڑ رہی تھی۔ اجالے کے پیشِ نظر ننھی منی بوندیں چاندی کے تاروں جیسی لگ رہی تھی۔ سیاہ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے کہ اس کے اوپر شیشہ بچھا دیا گیا ہو پھر اس کی پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ اس نے ٹامی کو جگایا اور چہل قدمی کے لئے چل دیا۔ پارٹی سے بچنے کے لئے وہ عقبی دروازے سے نکلا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کے کپڑے بھیگ گئے۔ ٹامی اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ راہ میں ایستادہ درخت بارش میں دھل کر چمکدار ہو گئے تھے۔ قریب سے بھری ہوئی ٹیکسیاں گزر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی نہیں تھا۔

جب اسے اندازہ ہو گیا کہ ٹامی تھک گیا ہے تو وہ گھر واپسی کے لئے مڑ گیا۔ اس نے ٹامی کو گود میں اٹھا لیا۔ کیونکہ ٹامی سے اب چلا نہیں جا رہا تھا۔ ٹامی اس کے سینے سے لگا کپکپاتا رہا۔ گھر پہنچ کر اس نے ٹامی کو خشک کیا اور خود بھی گرم پانی سے نہایا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور ٹامی کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔

پھر اس نے تھامس مین کی مختصر کہانیوں کا مجموعہ اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ٹونیو کروگر نامی کہانی اسے اچھی لگی۔ اسے فوٹوگرافی سے عشق تھا لیکن اس نے کبھی خود کو آرٹسٹ نہیں سمجھا تھا۔ کہانی کا مرکزی کردار کروگر ایسا ہی شخص تھا جسے فوٹوگرافی سے عشق تھا۔ اس عشق پر کئی برس صرف کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس چکر میں وہ ان لوگوں سے دور ہو گیا ہے' جن سے محبت کرتا تھا۔ انہیں گنوا بیٹھا ہے۔ وہ ان سے ملنے کے لئے

تڑپنے لگا۔ پھر راشد کہانی کے اس موڑ پر پہنچا جہاں کروگر نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹوٹے ہوئے تعلقات دوبارہ استوار کرنے کی خاطر سب کچھ چھوڑ سکتا ہے.......... ہر چیز سے دستبردار ہو سکتا ہے۔ وہاں تک پڑھنے کے بعد کہانی میں راشد کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کے لئے یہ حماقت ناقابلِ یقین تھی کہ ایک ایسا شخص' جو ایک فن میں کمال حاصل کرنے والا ہے' محض لوگوں سے ملنے جلنے کی آرزو میں اس فن کو لات بھی مار سکتا ہے۔ تھامس مین نے ایک تنہائی زدہ شخص کو لفظوں میں پینٹ کیا تھا اور اس صورت میں راشد کو اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے نزدیک تنہائی انسان کے لئے قوت کا منبع تھی لیکن اگر کوئی شخص خود کو تنہا سمجھ کر خود رحمی میں مبتلا ہو جائے تو وہ کمزوری بن جاتی تھی اور ایسے کسی جذبے کو عظیم ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس نے کہانی ختم کی ہی تھی کہ راہ داری میں قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ سمجھ گیا کہ ڈیڈی آ رہے ہیں۔ ڈیڈی پہلے ہی جیسے تھے۔ خوبرو' باوقار اور خوش لباس لیکن وہ ڈیڈی کی نجی زندگی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ ان کی سلمان سے دوستی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا' اس کی انہیں کچھ پروا بھی نہیں تھی لیکن ان کا اپنا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ہر سال ڈیڑھ دو مہینے کے لئے وہ کہیں غائب ہو جاتے.......... اور اس کا تعلق کام سے نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کا عرصہ تفریح تھا۔ راشد کو شک تھا کہ اس عرصے میں وہ بھی رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ اسے احساس تھا کہ وہ ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اسے کسی کمی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

"ہیلو ڈیڈی!" اس نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ "پارٹی ختم ہوئی یا نہیں؟"

"پارٹی! مجھے تو نیچے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ تمہاری ممی اپنے کمرے میں جا چکی ہیں۔ میری فلائٹ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی۔" نوید حسن نے جیب سے ایک خط نکال کر بیٹے کی طرف بڑھایا۔ "یہ پڑھ لو۔"

راشد نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ لفافے پر یونیورسٹی پوسٹ آفس کی مہر تھی۔ خط وائس چانسلر کے لیٹر پیڈ پر تحریر کیا گیا تھا۔

ڈیئر مسٹر حسن!

آپ کے بیٹے کی تحریری درخواست ہمارے پاس ہے جس میں

اس نے یونیورسٹی چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اس سلسلے میں آپ سے اجازت لے لی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ چکا ہے.......... اور ہمیں امید ہے کہ اب تک بخیریت گھر پہنچ چکا ہو گا۔

یہ بتانا ضروری ہے کہ اس کے اس فیصلے کا تعلق اس کے روم میٹ اور دوست مظفر ملک کی موت سے ہے۔ آپ کو یقیناً علم ہو گا کہ آپ کے بیٹے نے اتوار کی شام کو چار بجے پولیس کی مدد طلب کی تھی۔ پولیس والے آئے تو انہوں نے آپ کے بیٹے کو کمرے میں پایا۔ اس کا ساتھی مظفر ملک مر چکا تھا۔ اس نے بلیڈ سے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ لیں تھیں۔ آپ کے بیٹے نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ مظفر ملک نے خودکشی سے پہلے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اس نے اس کی حوصلہ شکنی کی نہ حوصلہ افزائی' بلکہ جس دوران مظفر نے اپنی کلائیاں کاٹیں' وہ اسی کمرے میں موجود مطالعہ کرتا رہا۔ پولیس کے استفسار پر آپ کے بیٹے نے کئی بار یہ کہا کہ مظفر آزاد انسان تھا اور اسے اپنے بارے میں پوری آزادی سے فیصلہ اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حق تھا اور یہ کہ اسے مظفر کو باز کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

یونیورسٹی میں آپ کے بیٹے کی تعلیم اور کھیل کے میدان میں کارکردگی کا ریکارڈ نہایت اعلیٰ رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھی طلباء میں مقبول بھی ہے۔ ہم ایسے ہونہار طالب علم سے تعلق توڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ واپس آنے کا خواہاں ہو تو ہمیں خوشی ہو گی لیکن اس نے ہمارے ماہر نفسیات ڈاکٹر حشمت کو زیادہ وقت نہیں دیا کہ وہ اس کا کیس سمجھ سکتے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ آپ کے بیٹے کو کسی ماہر نفسیات کی رہنمائی اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔

اگر آپ کو اس سلسلے میں معلومات درکار ہوں اور آپ یہاں آ سکیں تو ہمیں آپ کی مدد کر کے مسرت ہو گی۔ پولیس رپورٹ اور اس ناخوشگوار واقعے کے سلسلے میں مکمل ریکارڈ آپ کو دکھایا جا سکتا ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

راحت وسیم۔ وائس چانسلر

"تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟" نوید حسن نے بیٹے سے پوچھا اور اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔ راشد کو کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے انہیں کبھی یوں ڈھیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

"آپ کیسے ہیں ڈیڈی؟" اس نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا "آپ کا سفر کیسا رہا؟"

"بہت اچھا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "سنو راشد.......... قانونی طور پر تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ لہٰذا تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اور قانون سے ہٹ کر؟"

"میرا خیال ہے کہ تم نے شوپنہار کر بکثرت پڑھا ہے۔"

"جی ہاں۔" راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں وجود کے بارے میں تم جس طرزِ عمل کا اظہار کر رہے ہو' وہ حقیقی نہیں ہے اور لوگوں نے اس سلسلے میں سوچا ہے.......... اور اسے اختیار بھی کیا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں ان افکار کو آزمانے کا حق ہے۔ جو تمہارے خیال میں اس قابل ہیں۔"

راشد ٹامی کا کان سہلاتا رہا۔ ٹامی سو چکا تھا۔ "کیا آپ کے خیال میں مجھے کسی ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے؟"

"جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ تمہیں برے بھلے کی تمیز نہیں ہے' قانونی طور پر تم ہوش مند انسان ہو۔ یہ ہوش مندی کی بے حد غیر معقول تعریف ہے۔ تمہارا نظریہ ہے کہ تمہیں اسے خودکشی سے روکنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں اس حق کا علم نہیں تھا' لیکن اس سلسلے میں ایک عام جذباتی آدمی کا نقطہ نظر یقینی طور پر یہی ہو گا کہ تم غلطی پر تھے۔ تم سے اخلاقی جرم سرزد ہوا۔"

راشد کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ "مجھے ماہرِ نفسیات کی مدد کی ضرورت ہے یا نہیں؟"

"میرے خیال میں تو ہر شخص کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم چاہو تو مل لو۔

اس میں کوئی حرج نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔"

"اب یونیورسٹی تو تم چھوڑ چکے۔ آگے کیا ارادہ ہے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔ فی الوقت میرا کوئی ارادہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے سکون سے رہو اور سوچو۔ میرے ساتھ اسکواش کھیلو۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں گا۔" نوید حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔

"او کے ڈیڈی۔"

"یہ کتا کہاں سے آیا؟" انہوں نے ٹامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج صبح ہی خریدا ہے۔"

"اچھا بیٹے.......... گڈ نائٹ۔"

☆======☆======☆

ڈیڈی نے اسے کلب میں مدعو کیا تھا۔ انہوں نے اسے بہت سے دوستوں سے ملوایا۔ ان لوگوں نے خوش مزاجی سے اس سے رسمی گفتگو کی اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ان کا پسندیدہ موضوع کاروبار تھا۔ راشد جانتا تھا کہ وہ اس سے کیا توقع کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ ان کی باتیں توجہ سے سنے اور کاروباری اسرار و رموز سمجھے۔

اس نے ڈیڈی کو دوسروں سے بات چیت کرتے بھی دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ جن لوگوں سے اس کے ڈیڈی کا کاروباری تعلق ہوتا ہے' وہ انہیں آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں ان کی کمزوریاں ذرا دیر میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کب کون اپنے مؤقف پر ابتدا میں سختی سے ڈٹنے کے بعد اچانک پسپا ہو جائے گا اور کون غلطی پر ہونے کے باوجود اڑا رہے گا۔ کس پر بچوں کی طرح قابو پایا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کے لئے بے حد سادہ و آسان تھا.......... ریاضی کے سوالوں کی طرح۔

پھر وہ اسکواش کھیلنے چلے گئے۔ راشد نے نوید حسن کو ایک پوائنٹ بھی نہیں لینے دیا۔ نوید حسن پورے کورٹ میں دوڑتے رہے۔ یہ نہیں کہ کھیل کے اور تکنیک کے اعتبار سے وہ کمزور ہوں لیکن راشد تو ناممکن قسم کی ریٹرن بھی بڑے آرام سے دے رہا تھا۔ انہوں نے کھیل شروع کرنے سے پہلے راشد سے کہہ دیا تھا کہ وہ یقینی طور پر جیتیں

گے اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے پہلے گیم میں اپنی تمام مہارت اور تجربہ اور تمام توانائیاں صرف کر دیں۔ انہوں نے بہت خوبصورت ڈراپ شاٹ کھیلے لیکن راشد کے پاس جیسے ہر شاٹ کا جواب تھا۔ راشد اتنی آسانی اور وقار کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اسکواش جیسا سخت کھیل بھی آسان نظر آ رہا تھا۔

پھر نوید حسن نے چیلنج کیا کہ وہ کم از کم ایک پوائنٹ ضرور لیں گے۔ مگر سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ راشد کو اس سے غرض نہ تھی کہ اس کے مقابل کون ہے۔ کھیل کی حرمت کے علاوہ کھیل کے دوران میں اسے کچھ یاد نہیں رہتا تھا۔ اسے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ اس کا باپ اب بری طرح ہانپ رہا ہے۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ ڈیڈی کو اس سے بہتر کھیلنا چاہئے۔

کھیل کے اختتام پر نوید حسن نے کہا۔ ”اچھی ایکسرسائز ہو گئی۔ ہمیں کھیلتے رہنا چاہئے۔“

وہ باہر نکلے۔ نوید حسن کو حیرت تھی کہ راشد نہ تو پسینے میں نہایا ہوا تھا اور نہ ہی اس کی سانسیں خفیف سی بھی ناہموار تھیں۔

راشد نے اس کے بعد کبھی ان کے ساتھ اسکواش نہیں کھیلی تاہم وہ ہفتے میں کم از کم تین دن کلب ضرور جاتا اور دو تین گھنٹے ورزش کرتا لیکن ٹینس یا اسکواش کے لئے اسے پارٹنر مشکل ہی سے ملتا تھا۔

منگل کو مولانا نصیر سے ملاقات ہوئی۔ مولانا بڑے نرم خُو اور بے حد نرم گفتار تھے۔ ان کی شخصیت ذہن پر بے حد خوشگوار اثر مرتب کرتی تھی۔ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر مولانا نے کہا۔ ”بیٹے.......... یونیورسٹی میں تمہارے ساتھی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا‘ اس کے متعلق تمہاری ماں نے مجھے بتایا ہے۔ میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ہم تمہاری پوزیشن سمجھتے ہیں۔ خوف ایک فطری چیز ہے۔ بعض اوقات بڑے مضبوط لوگ بھی خوف کی گرفت سے نہیں بچ سکتے اور خوف انسان کو مفلوج کر دیتا ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے تھا مگر تمہیں موقع ہی نہیں ملا۔ خوف نے تمہیں کچھ کرنے نہیں دیا۔ تم تو ویسے بھی نوجوان ہو۔ یہ ملعون تو پختہ لوگوں کو بھی لرزا دیتا ہے‘ لیکن بیٹے

میں ایک چیز یاد دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی تکلیف کی طرح محسوس کرنا چاہئے۔ انہیں اس سے بچانے کی.......... ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اگر وہ کوئی غلطی کریں تو انہیں ٹوکو۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ خدا کے فضل و کرم سے تم مسلمان پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں خدا کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنا چاہئے۔ قرآن پاک کا مطالعہ کرو۔ نماز قائم کرو پھر کوئی خوف تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔“ مولانا یہ سب کہہ کر بہت پُرسکون ہو گئے۔

راشد کو وہ بہت اچھے لگے۔ انہیں جو کچھ کہنا تھا‘ اس کے لئے وہ تیاری کر کے آئے تھے اور وہ سچ مچ اسے اپنی ذمے داری سمجھتے تھے لیکن دوسروں کی طرح صرف ظاہری طور پر نہیں۔ وہ اپنے طور پر اس کے احساسِ جرم کے لئے مرہم لے کر آئے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ خود نہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا اور نہ ہی اسے کوئی احساسِ جرم تھا۔

راشد انہیں رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ ”راشد.......... تم کبھی ہمارے مدرسے بھی آؤ۔ وہاں تم جیسے نوجوانوں کی تعداد بھی کم نہیں۔“ مولانا نے کہا۔

”جی حضرت.......... میں ضرور آؤں گا۔“

مولانا نے اس سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

☆======☆======☆

سمیرا کا خط جمعرات کی شام کو موصول ہوا۔ راشد کہیں گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو خط اسے اپنے کمرے میں میز پر رکھا ملا۔ یونیورسٹی کا پتہ لکھا تھا۔ یونیورسٹی والوں نے وہ پتا کاٹ کراس کی جگہ اس کے گھر کا پتہ لکھ دیا تھا۔

اس نے خط کھول کر پڑھا۔

مسٹر راشد نوید!

مجھے تم سے نفرت ہے۔ میرا بھائی مظفر اچھا لڑکا تھا.......... خوش مزاج۔ اسے لمبی عمر گزارنے کا حق تھا۔ اسے بہت عرصہ جینا تھا لیکن وہ یقیناً شیطانی صحبت اور اثرات کا شکار ہوا ہو گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم شیطان ہو۔ جو شخص اپنی موجودگی میں اپنے عزیز ترین دوست کو

کلائیاں کاٹنے دے.......... اسے سُست روی سے قدم قدم موت کی طرف بڑھتا دیکھے.......... اور کچھ نہ کرے' وہ شیطان ہی ہو سکتا ہے.......... برائی کا نمائندہ!

مجھے امید ہے کہ اس کی اذیت ناک یاد کبھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ مجھے امید ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے' وہ تمہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم تا ابد جہنم کی آگ میں جلو گے۔

سمیرا ملک

راشد نے خط طے کر کے لفافے میں رکھا اور لفافہ میز پر رکھ دیا پھر اس نے ٹامی کو گود میں اٹھایا اور اسے اگلا سبق دینے لگا۔ ٹامی بہت تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا سیکھ گیا تھا۔ وہ راشد کو خوش کرنے اور انعام میں بسکٹ جیتنے کا شدت سے خواہاں تھا۔ راشد نے دو گھنٹے ٹامی پر صرف کئے پھر سمیرا کا خط دوبارہ پڑھا پھر اس نے دراز سے سمیرا کی تصویر نکالی جو مظفر کے سامان سے نکلی تھی۔ وہ دیر تک خط اور تصویر سامنے رکھے انہیں دیکھتا رہا جیسے تحریر اور چہرے کے نقوش یکجا کر رہا ہو۔

اس رات اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مظفر کے گھر والوں کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہے۔ لفافے پر سمیرا کا پتہ درج تھا۔ خط مری سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ یہ سال کا وہ حصہ تھا جب مری کا ماحول اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہاں عام طور پر بڑے لوگوں کا ہجوم رہتا تھا لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جانتے تھے کہ مری میں خوشگوار ترین وقت ماہِ اگست ہی ہوتا ہے۔ تاہم وہاں جون جولائی جیسی بھیڑ نہیں ہوگی۔

اس نے سوچا' اپنی اصلیت چھپانا کچھ دشوار نہیں ہوگا۔ اب اسے صرف تفصیلات اور جزئیات طے کرنا تھیں۔

لیکن اس کی سمجھ میں اپنی اس خواہش کا جواز نہیں آ رہا تھا۔ وہ سمیرا کی طرف اس طرح کیوں کھنچ رہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ پہلی بار.......... زندگی میں وہ بغیر سوچے سمجھے بُوجھے اپنی کسی خواہش پر عمل کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنا بینک اکاؤنٹ مری کے بینک میں منتقل کروا

دیا۔ وہ جیب خرچ سے کچھ زیادہ رقم نہیں بچاتا رہا تھا لیکن ایک سال پہلے بانڈ کے ذریعے اس کا ایک لاکھ روپے کا انعام نکلا تھا۔ اس میں سے اس نے کچھ خرچ نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ ٹامی کے لئے ایک سوٹ کیس میں سوراخ کیا تاکہ ہوا کا بندوبست رہے پھر وہ مری کے لئے روانہ ہو گیا۔

مری میں اختر ملک کا بنگلا اس حصے میں تھا جہاں ہر سال موسم گرما میں تفریح کی غرض سے آنے والوں کے بے شمار بنگلے تھے۔ اس علاقے میں ایک اعلیٰ درجے کا ہوٹل بھی تھا۔ مری پہنچتے ہی راشد نے اس ہوٹل کا رخ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے نیچے ایک عام سے ہوٹل میں سستا سا کمرا لے لیا۔ اسے اپنی شخصیت بھی تو چھپانا تھی۔ اس نے اپنا نام راشد حسن لکھوایا تھا۔

ہوٹل میں سامان رکھنے کے بعد اس نے ٹامی کو لیا اور ٹہلتا ہوا اس طرف چل دیا۔ جہاں اختر ملک کا بنگلہ تھا۔ وہ بنگلے کے سامنے سے گزرا۔ بنگلے کے گیٹ پر اختر ملک کے نام کی نیم پلیٹ لگی تھی۔ تمام بنگلے تقریباً ایک جیسے تھے۔ اندر دیوار کے ساتھ درخت لگے تھے۔

ایک چکر لگانے کے بعد وہ قریبی ہوٹل کی طرف چل دیا۔ ہوٹل کے ریستوران میں اس نے چائے پی پھر کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے گفتگو کی۔ وہ شخص ہوٹل کا مالک تھا۔ اس کا نام رزاق خاں تھا۔ باتوں ہی باتوں میں راشد نے اسے بتایا کہ وہ طالبعلم ہے اور تفریح کی غرض سے آیا ہے۔

"کچھ عرصے کے لئے کام مل سکتا ہے؟" راشد نے پوچھا۔

"اب تو سیزن ختم ہونے والا ہے۔ بہر حال کام مل سکتا ہے۔ گھڑسواری آتی ہے تمہیں؟" رزاق خاں نے پوچھا۔

"جی ہاں مگر کام کی نوعیت کیا ہوگی؟"

"پہلے تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہیں گھڑسواری آتی ہے۔" رزاق نے کہا پھر وضاحت کی۔ "صاحب لوگوں کے بیٹے بیٹیاں گھڑسواری کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انہیں گھوڑے اور گھڑسوار فراہم کرتے ہیں کیونکہ ان میں بیشتر کو گھڑسواری نہیں آتی۔"

راشد کو خاصی مایوسی ہوئی۔ رزاق خاں کو اس کے چہرے سے اس کی مایوسی کا

اندازہ ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "ہم تنخواہ معقول دیتے ہیں۔ رہائش اور کھانا الگ.......... ہوٹل کی طرف سے۔"

"یہ بات نہیں۔"

"اور کام بڑا دلچسپ ہے۔" رزاق خاں نے بائیں آنکھ دبا کر کہا۔ "تم خوبصورت ہو۔ اسی لئے تو میں تمہیں رکھ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" راشد سے اپنی حیرانی چھپائی نہیں گئی۔

"یہ صاحبوں کا لڑکی لوگ شہری ہوتے ہیں نا۔ بہت آزاد ہوتے ہیں۔ گھڑسواری سے زیادہ گھڑسوار میں دلچسپی لیتے ہیں۔ میرے پاس ایک مقامی لڑکا ہے.......... بہت خوبصورت ہے وہ۔ شمشیر نام ہے۔ شہر کے کالج میں پڑھتا ہے۔ ہر سال گرمیوں میں یہاں آتا ہے تو میرے لئے کام کرتا ہے۔ اس کے چکر چلتے ہیں۔ لڑکیوں سے دوستی ہو جاتی ہے۔ پیسے الگ۔ مجھے بھی فائدہ ہوتا ہے۔"

راشد کو اچانک کام میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا' اس طرح سمیرا ملک کو قریب سے دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ وہ یقیناً یہاں آتی ہو گی پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔ "بنگلے والے بھی آتے ہیں یہاں گھڑسواری کے لئے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں سبھی آتے ہیں۔ مگر اس وقت بیشتر بنگلے خالی پڑے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' مجھے معاوضہ کیا ملے گا؟"

"پہلے گھڑسواری کر کے دکھاؤ۔"

رزاق خاں اسے ہوٹل سے ملحق اصطبل کی طرف لے گیا۔ اس نے ایک گھوڑے پر زین ڈالی اور باگیں راشد کو تھما دیں۔ "یہ سامنے میدان ہے۔ اس میں اپنے جوہر دکھاؤ۔" اس نے ہوٹل کے سامنے والی سرسبز ڈھلان کی طرف اشارہ کیا۔

☆======☆======☆

رزاق خاں راشد کی گھڑسواری سے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ایک کمرے کی چابی راشد کو دے دی۔ ایک ماہ کا معاوضہ دو ہزار روپے طے پایا۔ کام کے اوقات صبح دس بجے سے شام چھ بجے تک تھے۔

"اب شمشیر کو مقابلہ کرنا پڑے گا۔" رزاق خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پہلے ہر لڑکی صرف اس کے ساتھ گھڑسواری کرنا چاہتی تھی۔"

راشد اپنا سامان نیچے والے ہوٹل سے اٹھا لایا۔ ٹامی کی موجودگی پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

شام کو اس کی ملاقات شمشیر سے ہوئی۔ شمشیر کی عمر اکیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ طویل القامت اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ لڑکیاں یقیناً اس پر منڈلاتی ہوں گی لیکن راشد کو اندازہ ہوا کہ وہ ذہین نہیں ہے۔ وہ مسکراتا تو چالاک لگتا۔ ویسے اس کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔

ان کی ملاقات راشد کے کمرے میں ہوئی۔ شمشیر نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر سامان کھلوانے اور ترتیب سے لگانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ راشد کو اس بات پر اطمینان ہوا کہ شمشیر باتونی نہیں ہے۔ راشد نے شمشیر کو اپنے بارے میں بتایا لیکن ایک بات چھپا لی کہ وہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ شمشیر نے بتایا کہ سیزن ابھی ختم نہیں ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگ تو ابھی آنے والے ہیں۔ دونوں بہت جلد گھل مل گئے۔

شمشیر کا پسندیدہ موضوع گھڑسواری اور لڑکیاں تھیں۔ وہ انہی کے بارے میں باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں دسیوں رومانوی قصے سنا ڈالے۔

اگلے روز سے کام شروع ہوا۔ آنے والی لڑکیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ راشد کی وجہ سے شمشیر کا کام بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ توقع کے عین مطابق لڑکیوں نے راشد کو بہت پسند کیا تھا۔

گھڑسواری کے لئے ایک مخصوص روٹ تھا۔ پہلے ہی روز راشد کو اندازہ ہو گیا کہ لڑکیاں بہت آزاد رو ہیں لیکن وہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تاہم اس نے کسی لڑکی کو زیادہ آگے نہیں بڑھنے کا موقع نہیں دیا۔

تین دن گزر گئے۔ سمیرا اس طرف نہیں آئی۔ دوسری طرف اب ہر لڑکی گھڑسواری کے لئے راشد کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سب کی سب اسے ترغیب دینے والی نظروں سے دیکھتیں۔ بعض من چلی لڑکیاں تو فقرے بھی چست کر دیتیں۔

تیسری شام راشد نے سمیرا کے سلسلے میں شمشیر کو کریدا۔ "اوہ.......... وہ.......... تم اسے جانتے ہو؟" شمشیر نے پوچھا۔

"نہیں' اپنے ایک دوست سے تذکرہ سنا تھا۔"

"وہ یہاں کم ہی آتی ہے۔ اس بار آئی تھی لیکن تین چار دن کے لئے اسلام آباد گئی ہوگی۔ دو ایک دن میں واپس آجائے گی۔ اس کے والدین عام طور پر سفر میں رہتے ہیں۔ ویسے لڑکی بہت خوبصورت ہے۔"

"واقعی؟"

"ہاں' پچھلے دنوں اس کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہوئی ہے۔ اس کے ایک بھائی نے جو کراچی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا' اپنے ہاسٹل کے کمرے میں خودکشی کرلی۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"اسلام آباد اور مری میں قریبی رشتے داری ہے۔ اسلام آباد میں کچھ ہو تو مری والے اس سے کبھی بے خبر نہیں رہتے۔" شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"خودکشی کی وجہ؟"

"کسی لڑکی کا چکر تھا اور وہ لڑکی اس کے روم میٹ اور عزیز دوست پر فدا تھی۔ دوست بھی کیا' بہت بے رحم آدمی ہوگا۔ دوست کو اپنی جان لیتے دیکھتا رہا' یہ نہیں ہوا کہ اسے بتا دیتا کہ مجھے اس لڑکی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ارے.......... اس نے تو اسے خودکشی سے باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تماشا دیکھتا رہا۔"

لڑکی کے حوالے پر راشد کو ثمینہ کا خیال آگیا۔ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ مظفر جانتا تھا کہ اسے ثمینہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے خودکشی تو ممکن ہے' ثمینہ کی وجہ سے کی ہو۔ کم از کم وہ اس کا سبب ہرگز نہیں تھا پھر بھی اس نے شمشیر سے پوچھا۔ "تو تمہارے خیال میں سمیرا کے بھائی کی موت کا ذمہ دار اس کا روم میٹ اور دوست تھا؟"

"سو فی صد وہی ذمے دار تھا۔ میں تو اسے قتل کہوں گا۔ یوں کوئی کسی غیر کو بھی اپنے سامنے خودکشی کرتے نہیں دیکھ سکتا' دوست تو دور کی بات ہے۔" شمشیر نے کہا پھر اچانک بولا۔ "ایک مشورہ دوں' سمیرا سے دور ہی رہنا۔"

"کیوں؟"

"دیکھو وہ بڑے لوگ ہیں' بہت بڑے۔ ان کی زندگی میں مجھ جیسوں اور تم جیسوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔"

"اچھا؟"

"ہاں۔ اگر تم بھی دولت مند ہوتے تو اور بات تھی۔ لہٰذا اس سے دور ہی رہنا۔ ویسے یہاں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔"

"بشرطیکہ تم سے محفوظ رہیں۔"

شمشیر پھول گیا۔ "ارے نہیں۔ ہم دونوں کی خوب نبھے گی۔ میں نے کچھ نیچے درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان ایک کیبن بنایا ہے۔ تمہیں دکھا دوں گا۔ ضرورت پڑنے پر تم اسے استعمال کرسکتے ہو۔"

"شکریہ دوست!"

☆======☆======☆

راشد سمیرا کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ دوسری لڑکیوں کے لئے وہ پسندیدہ ترین موضوعِ گفتگو بن گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہوں نے اس جیسا لڑکا پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ سرگوشیوں سے اس کے متعلق باتیں کرتیں' آہیں بھرتیں۔ اسے مغرور قرار دیتیں۔ ایک من چلی نے اس کا نام گلیشیر رکھ دیا۔ چند ایک نے تو اسے محبت بھرے خط تھما دیئے تھے۔

راشد جانتا تھا کہ ان میں سے بیشتر لڑکیاں صرف رومانس اور ایڈونچر کی خواہش مند ہیں۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو اس وقت تک خراب نہیں سمجھا جب تک لڑکی نے خود کو خراب ثابت نہیں کردیا۔ ایسے میں وہ کوئی رعایت بھی نہیں کرتا تھا۔

ٹامی کو بہت زیادہ توجہ مل رہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ وہ راشد کا پالتو کتا ہے۔ سب اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ ٹامی اس کا عادی نہیں تھا لیکن اسے وہ سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ اب وہ خاصا بڑا اور موٹا تازہ ہوگیا تھا۔ اس نے طرح طرح کے کھیل سیکھ لئے تھے اور اشاروں پر عمل کرتا تھا۔ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی۔ وہ خوش اطوار تھا اور کبھی کسی کی پریشانی کا باعث نہیں بنتا تھا۔ البتہ اس کا کھلنڈرا پن پہلے سے

بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ پھر رزاق خاں کی کتیا سے اس کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ وہ اس پر بری طرح فدا تھا مگر دوسری طرف سے اسے لفٹ نہیں مل رہی تھی۔ لڑکیوں کے لئے اس کا ناکام رومانس بھی دلچسپی کا باعث تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ راشد کی سنگدلی کی سزا اس کے کتے کو مل رہی ہے.......... بے چارہ! وہ ان سب کو ہی بہت پیارا لگتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اسے راشد تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔ جس وقت راشد کسی کی گھڑسواری کر رہا ہوتا' لڑکیاں ہی ٹامی کا خیال رکھتی تھیں۔

راشد تین چار بار شمشیر کے کیبن میں جا چکا تھا۔ دن میں وہ جب بھی یکجا ہوتے شمشیر لڑکیوں کے متعلق باتیں کرتا رہتا۔ وہ لڑکیوں کے اصطلاحوں جیسے نام رکھنے میں ماہر تھا۔ کسی کو بوٹی قرار دیتا' کسی کو چھوٹی مرچ اور کسی کو تاڑ کا خطاب دیتا۔ راشد سے کئی لڑکیاں اظہارِ محبت کر چکی تھیں لیکن انہیں راشد کے بے تاثر چہرے پر کبھی کوئی ردِعمل نظر نہیں آیا تھا.......... نہ مثبت نہ منفی۔ جیسے وہ جانتا ہو کہ یہ بے ضرر سے رومانوی کھیل کا ایک حصہ ہے۔ البتہ جہاں اسے سنجیدگی محسوس ہوتی' وہ سختی سے ٹوک دیتا۔ کہتا میں تو محبت کے ہجے بھی نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں شمشیر کی پالیسی اور تھی۔ اظہارِ محبت کے جواب میں وہ اور زیادہ شدت سے اظہارِ محبت کرتا۔ وہ ہر لڑکی سے یہی کہتا.......... رُوئے زمین پر تم جیسی حسین کوئی اور لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔

پھر ایک دن سمیرا بھی آ ہی گئی۔ اس وقت تک راشد کے قیام کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ راشد نے کسی لڑکی کو اس کا نام لیتے سنا تو چونک کر اس کو دیکھا۔ ویسے وہ اسے پہچان ہی نہیں پاتا.......... وہ اپنی تصویر سے بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ اسے دیکھ کر راشد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ ٹینس کھیلتی رہی ہے۔

راشد نے جلدبازی کرنے کے بجائے تحمل سے کام لیا۔ ایک تو یہ کہ وہ دلچسپی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس طرح راستہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرا اسے یہ ڈر تھا کہ وہ اسے پہچان نہ لے۔ ممکن ہے' مظفر کے پاس اس کی کوئی تصویر رہی ہو جو سمیرا نے دیکھی ہو۔ ویسے بھی وہ چاہتا تھا کہ سمیرا اسے اردگرد دیکھنے کی عادی ہو جائے تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے کہ وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔

لیکن دو دن گزر جانے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ سمیرا اسے نہیں پہچانتی۔ وہ اِدھر

اُدھر جاتے کن آنکھوں سے اسے دیکھتا۔ وہ بھی زیادہ گھلتی ملتی نہیں تھی۔ تاہم اسے احساس ہو گیا کہ وہ بار بار بغور اسے دیکھتی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کبھی نہیں جھلکی۔ راشد مطمئن ہو گیا۔

ایک شام وہ گھوڑے کو اصطبل کی طرف لے جا رہا تھا کہ کسی نسوانی آواز نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سمیرا تھی۔

"میں سمیرا ملک ہوں۔"

راشد ٹھہر گیا۔ وہ اس کی طرف چلی آئی۔ "میں گھڑسواری کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"لیکن اب میری چھٹی ہو گئی ہے۔"

وہ مسکرا دی۔ "اسے اوور ٹائم سمجھ لو۔"

"ٹھیک ہے۔"

راشد نے اسے گھوڑے پر بیٹھنے میں مدد دی۔ پھر وہ اسے لے کر مخصوص راستے پر چل دیا۔ گھوڑے کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سمیرا اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ وہ بے دھیانی سے جواب دیتا رہا پھر اس نے گھوڑے کا رخ شمشیر کے کیبن کی طرف کر دیا۔ سمیرا نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن اس کی نظروں سے چوکنا پن جھلکنے لگا۔

راشد نے کیبن پہنچ کر گھوڑے کو قریبی درخت سے باندھا اور جیب سے چابی نکال کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ "اندر نہیں چلو گی؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟"

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

"یہ مت بھولو کہ اب میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں۔"

"تم بھی ایک بات یاد رکھنا۔ میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑا کھولا' اچھل کر اس پر سوار ہوئی اور بڑی مہارت سے اونچے نیچے راستوں پر دوڑانے لگی۔ راشد حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی اچھی

گھڑسوار ہے۔

کچھ دور جا کر سمیرا نے گھوڑے کو واپس موڑا اور اسی رفتار سے دوڑاتی ہوئی کیبن تک لے آئی۔ پھر اس نے گھوڑے کو درخت سے باندھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "اب چلو۔" چند لمحے بعد اس نے کہا۔

وہ دونوں کیبن میں داخل ہوئے کیبن میں دو کرسیاں تھیں۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ راشد نے سمیرا کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کونے میں رکھے ہوئے مٹکے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے مٹکے سے پانی نکال کر پیا۔ پھر سمیرا کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف سمیرا کی پیٹھ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا رہا قریب پہنچ کر اس نے بڑی نرمی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے.......... اور پھر اس کے بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

سمیرا اچھل کر کھڑی ہوئی۔ پلٹتے پلٹتے اس کا ہاتھ گھوم چکا تھا۔ راشد نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیفیت بدل گئی۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کے کندھے سے سر ٹکا لیا۔

دیر تک وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر سمیرا نے اس کے کندھے سے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "تم وقت ضائع نہیں کرتے؟"

"ہاں مجھے ڈر لگتا ہے' شاید وقت بہت کم ہے۔"

وہ کیبن سے نکلے اور اسی انداز سے واپس ہوئے جیسے آئے تھے۔ سمیرا اناڑیوں کی طرح گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی تھی۔ راشد گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں لئے پیدل چل رہا تھا۔

شمشیر نے انہیں کیبن سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ تنہائی کا موقع ملتے ہی اس نے راشد سے کہا۔ "بے وقوف.......... میں نے تمہیں منع کیا تھا نا اس حماقت سے۔"

"تم فکر نہ کرو.......... وہ تفریح تھی.......... خالص تفریح!" راشد نے جواب دیا۔

☆======☆======☆

اگلی صبح راشد معمول کے مطابق جاگنگ کر رہا تھا۔ جاگنگ کے بعد وہ ایک درخت

سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹا تھا۔ ایسے میں اس نے سمیرا کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔

"صبح بخیر۔" سمیرا نے اس کے قریب آ کر کہا۔

"صبح بخیر۔ کیسی ہو سمیرا ملک؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا پھر ہچکچاتے ہوئی بولی۔ "تمہیں احساس ہے کہ یہاں تمام لڑکیاں تم پہ مرتی ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔ ہے نا خوفناک بات؟"

"تم خود فریبی کا شکار ہو؟ فریب بھی دیتے ہو؟"

"ذرا بھی نہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔" راشد نے کہا۔ "میرا نام راشد حسن ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" سمیرا نے متانت سے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی کل کی حرکت غیر مؤثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ وہ شرمندہ بھی ہوئی تھی لیکن اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس سے پہلے سمیرا کو کسی نے اس طرح نہیں چھوا ہوگا۔ اب اس کی بے نیازی سمیرا کے لئے پریشان کن ہوگی۔

"تم یقینی طور پر دھوکے باز آدمی ہو۔" سمیرا نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

"اور خود فریبی کے مریض بھی ہو۔"

"کیوں؟ تم یہ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے تو کل تم نے میرے ساتھ وہ حرکت کیوں کی؟ تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ وہ مجھے برا لگ سکتا ہے۔"

"لیکن وہ حرکت تمہیں بری نہیں.......... اچھی لگی تھی۔"

"میں مانتی ہوں تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تمہارے پاس اپنے اس اندازے پر یقین کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ بتاؤ.......... تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لئے کہ اتنی شدت سے کسی چیز کو میرا دل نہیں چاہا۔" سمیرا کے رخسار تمتما اٹھے۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا کوئی گھٹیا مقصد نہیں تھا۔ نہ میں تمہیں تکلیف پہچانا

چاہتا تھا۔"

"میں جانتی ہوں، لیکن تکلیف تو مجھے پہنچی نا۔" یہ کہہ کر سمیرا نے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے رخسار سے لگالیا۔ "پتا نہیں، مجھے کیا ہوگیا ہے۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کبھی ایسی بھی ہو سکتی ہوں.......... ایسا بھی کر سکتی ہوں۔"

راشد اپنے ردِعمل پر خود بھی حیران رہ گیا۔ اس کے پورے جسم میں کیف و انبساط کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ ایک مسرت آمیز سنسنی جو اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایسے لمس کا ذائقہ اس نے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ پچھلی تمام قربتیں بھرپور ہونے کے باوجود اس کے لئے بے رنگ و بے کیف رہی تھیں۔

"تم عجیب آدمی ہو۔ لڑکیاں کہتی ہیں کہ تم بے حس ہو لیکن مجھے تو تم گوشت پوست کے محسوسات سے لبریز انسان لگتے ہو۔"

محسوسات.......... جذبات! یہ وہ چیزیں تھیں جن سے وہ بچتا.......... دامن چھڑاتا آیا تھا مگر اب صورتِ حال کچھ اور تھی۔ وہ کچھ خوف زدہ ہوگیا۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "میں محسوسات سے عاری نہیں ہوں۔" اور یہ حقیقت تھی، اس وقت وہ خود کو سرد بالکل محسوس نہیں کر رہا تھا جیسا کہ لڑکیوں کی قربت میں ہمیشہ کرتا تھا۔ وہ دیر تک اس کے ہاتھ سے رخسار ٹکائے کھڑی رہی پھر اس نے بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑا اور بولی۔ "اب میں چلتی ہوں پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر وہ واپس چل دی۔ راشد بھی ہوٹل کی طرف واپس چل دیا۔

سامنے والی پہاڑی کی اوٹ سے سورج کی پہلی کرن جھانک رہی تھی۔

☆======☆======☆

اس روز راشد دیر تک خود کو سمجھنے کی کوشش میں الجھتا رہا۔ جو کچھ ہوا، وہ اس کے لئے نیا تھا۔ اس لڑکی نے نہ جانے کیا سحر پھونکا تھا کہ برسوں کے نظریات ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گئے۔ اس نے بچپن سے جو پہلی چیز سیکھی تھی، وہ جذبات سے اور بالخصوص محبت سے ڈرنا تھا۔ محبت اور توجہ اسے کبھی ملی بھی تو نہیں تھی۔

وہ سمیرا کے لمس کا اب بھی تصور کرتا تو جسم میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ جسم مرتعش ہو جاتا، جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تجربے نے اسے ہلا دیا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ وہ تجربہ بے حد شاندار، نرم اور حدت آفریں تھا۔ اسے لطف آیا تھا مگر وہ اس بات سے پریشان تھا کہ اس میں کوئی گڑبڑ کر دینے والی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

صبح دس بجے وہ باہر آیا تو سمیرا سے سامنا ہوگیا۔ وہ شاید اس کی منتظر تھی۔

"ساڑھے سات بجے مجھے لینے میرے گھر پر آ جانا۔ نیچے وادی میں گھومنے چلیں گے۔" سمیرا نے کہا اور یوں پلٹ کر چل دی جیسے صرف یہی کہنے آئی تھی۔

اس شام راشد ٹامی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

رزاق خاں نے اسے اپنی گاڑی کی چابیاں دیں اور نیچے جا کر گوشت لانے کی ہدایت کی۔ راشد ایسے موقعوں پر خوش ہوتا تھا۔ اس طرح اس کا ڈرائیونگ کا شوق بھی پورا ہوتا تھا۔ راشد کا ارادہ تھا کہ شمشیر کو ساتھ لے جائے گا لیکن جب اس نے شمشیر کو لڑکیوں میں گھرے دیکھا تو ارادہ ملتوی کر دیا۔ چنانچہ اس نے ٹامی کو پچھلی نشست پر بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے ہوٹل سے سڑک پر لے آیا۔ اس نے کار کی کھڑکیوں کے شیشے نہیں چڑھائے تھے۔

ٹامی عقبی نشست پر اپنے مخصوص انداز میں بیٹھا تھا۔ پچھلے پاؤں سیٹ پر اور دونوں اگلے پنجے اور تھوتھنی کھلی ہوئی کھڑکی پر رکھی تھی۔ کار میں سیر کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ وہ کبھی کبھی کھڑکی سے سر باہر نکال لیتا تھا۔

راشد نے گاڑی سڑک پر موڑ دی۔ دوسری طرف سے ایک کار آ رہی تھی۔ اسی وقت رزاق خاں کی کتیا نے بھونکنا شروع کر دیا۔ ٹامی ویسے ہی اس پر فدا تھا.......... اور کتیا نے پہلی بار اسے پکارا تھا۔ وہ بے تابانہ کھڑکی پر چڑھا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تک دوسری طرف سے آنے والی کار بہت قریب آ چکی تھی۔ کار کے ڈرائیور نے بریک لگانے کی بہت کوشش کی۔

راشد نے تیزی سے گاڑی روکی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ دوسری کار کا ڈرائیور بھی نیچے اتر چکا تھا اور بے بسی سے اپنی کار کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ راشد اس طرف

جھپٹا۔ اس نے دوسری کار کے ڈرائیور کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

ٹامی وھیل کے پیچھے پڑا تھا۔ وہ بری طرح زخمی ہوا تھا۔ وہ گھسٹ کر اپنی محبوب کتیا کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خود کو گھسیٹنا بھی اس کے لئے ناممکن تھا۔ راشد نے ہاتھ بڑھا کر اسے باہر کھینچ لیا۔ کچھ لوگ کار کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ڈرائیور صفائی پیش کر رہا تھا مگر راشد نے کچھ نہ سنا۔ وہ ٹامی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ٹامی کی نگاہوں میں دہشت تھی۔ اس کی پچھلی ٹانگیں محض دھاگے جیسی کھال کی وجہ سے دھڑ سے جڑی ہوئی تھیں۔ ورنہ ان کے الگ ہو جانے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔

راشد نے جان لیا کہ وہ اب بچ نہیں سکتا۔ جلد از جلد موت ہی اس کے لئے بہتر ہے لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اسے ختم کیسے کرے۔ وہ جتنی دیر تک زندہ رہتا' اتنی ہی اذیت اٹھاتا۔ راشد نے اپنی جیب ٹٹولی مگر اس میں چاقو نہیں تھا۔ بالآخر اس نے سختی سے کتے کے گلے پر ہاتھ جما دیا لیکن موٹی کھال کی وجہ سے دباؤ پورا نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دباؤ پورا ڈالا۔ اسے انگلیوں کے درمیان ربڑ کی طرح نرم اور لچک دار نرخرہ پھڑپھڑاتا محسوس ہوا۔ کتا زبان باہر نکال کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تھوتھنی دوسری طرف تھی لیکن وہ کبھی کبھی سر گھما کر راشد کو دیکھتا۔ اس کی نگاہوں میں خوف بھی تھا' التجا بھی اور تحمل و برداشت بھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا لیکن جیسے اسے راشد پر اب بھی اعتبار تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس کی بہتری ہی کے لئے کر رہا ہے۔

راشد کے ہاتھوں کا......... انگلیوں کا دباؤ بڑھتا رہا۔ زور لگانے سے اس کے ہاتھ اور کندھے لرزنے لگے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کتے کی گردن اتنی سخت ثابت ہو گی۔ راشد کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے اسے آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

شمشیر بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس نے راشد کو روکنے کی کوشش کی لیکن راشد بدستور دباؤ بڑھاتا......... اور لرزتا رہا پھر اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے کندھے تھپک رہا ہے......... اور کتا بھی بے جان ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پلٹ کر دیکھا۔ شمشیر اس کے کندھے تھپتھپا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ راشد نے ٹامی کو دیکھا۔ وہ

مر چکا تھا۔

راشد وہیں سڑک پر بیٹھا رہا۔ اس نے کتے کی گردن سے انگلیاں ہٹا لیں۔ اس کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں......... اور بہت زیادہ زور لگانے کی وجہ سے ان میں اینٹھن پیدا ہو گئی تھی۔ وہ دکھ رہی تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی اتنا زور نہیں لگایا تھا۔ تھکن کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر گیا تھا پھر وہ اٹھا......... اور اس نے جھک کر ٹامی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ گاڑی کی عقبی نشست پر ایک بڑا شاپنگ بیگ رکھا تھا۔ اس نے کتے کو بیگ میں ٹھونس دیا پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ نیچے بازار گیا۔ اس نے مطلوبہ سامان خریدا۔ اس دوران اس نے کسی کو حادثے کے بارے میں نہیں بتایا۔ سامان کی خریداری کے دوران وہ خوش دلی سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بک اسٹال سے ایک ڈائجسٹ بھی خریدا۔ اس کا انداز ہر روز جیسا تھا۔

سامان خرید کر وہ واپس آیا۔ اس نے سامان رزاق خاں کو دیا۔ اب اسے ٹامی کی تدفین کرنا تھی۔

☆======☆======☆

ٹامی کو دفن کر کے آتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے شمشیر کے الجھے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ خود اپنی سوچوں کا بھی تجزیہ کر رہا تھا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے نزدیک ٹامی کی کتنی اہمیت تھی۔ اسے احساس تھا کہ جو کچھ اس نے آج کیا تھا' ایسے منظر لوگ کبھی کبھار دیکھتے ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں تو ان کا جذباتی ردعمل بھی ہوتا ہے۔ خواہ ان کی حیثیت ایک عام تماشائی کی ہو اور راشد کو ایسے جذباتی ردعمل سے اور ایسے جذباتی لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ جذباتی فضول خرچی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ لوگ خود کو اپنے جذبات سے علیحدہ رکھنا سیکھ لیں۔ کیونکہ جذبات کے چکر میں وہ اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کرتے ہیں اور توانائی بھی۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ شمشیر آ گیا۔ اس وقت راشد منہ دھونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا بے دھیانی میں سیٹی بجا رہا تھا۔ شمشیر آتے ہی اس کے بستر پر گر گیا۔ "مجھے افسوس ہے راشد۔" اس نے کہا۔

"کیسا افسوس؟" راشد کا سیٹی بجانا موقوف ہو گیا۔

"ٹامی کے بارے میں۔ بہت اچھا کتا تھا وہ۔"

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس کو اس طرح ختم کرنا پڑا۔ کاش' اس وقت میری جیب میں چاقو ہوتا!"

"واقعی........... بہت تکلیف دہ کام تھا۔" شمشیر نے کہا۔ "ٹامی جس شخص کی گاڑی کے نیچے آیا' وہ بے چارہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ٹامی ایک دم ہی گاڑی کے سامنے آ گیا تھا اور وہ کوشش کے باوجود بروقت گاڑی نہ روک سکا۔ وہ بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام پتا بھی دیا۔" شمشیر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"تمہیں چاہئے اس کا نام اور پتا؟"

"نہیں۔"

"تو تم اس سے نہیں ملو گے؟"

"نہیں۔"

"وہ بے چارہ بہت شرمندہ تھا۔"

"خواہ مخواہ........... جب کہ اس کی کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔" راشد نے کہا۔

"اب میں اس سے ملوں گا تو وہ اور شرمندہ ہو گا۔"

"تمہاری مرضی۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

"کسی کے ساتھ سیر کو جانے کا ارادہ ہے۔ ہو سکتا ہے' کیبن کی طرف بھی جاؤں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ کس کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"سمیرا ملک کے ساتھ۔"

"حماقت........... بے وقوفی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ وہ کھیل کے لئے موزوں نہیں ہے۔ وہ بڑے گھر کی لڑکی ہے۔ اس کے لئے تو بڑا آدمی چاہئے۔"

"میں مستقبل کا بڑا آدمی ہوں۔" راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

"ایک بات سنو راشد۔ تمہیں اپنے کتے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کرنا پڑا۔ یہ ضروری

تھا؟"

"ہاں........... ضروری تو تھا۔"

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو یہ سب کچھ نہ کر سکتا۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"میرا مطلب ہے اتنی ہمت کم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں' اب اس قصے کو چھوڑو۔ وہ مردود کتا تو مر چکا تا..........."

شمشیر حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا...........

☆======☆======☆

اختر ملک کے بنگلے کا دروازہ ایک پہاڑی عورت نے کھولا۔ راشد نے اسے بتایا کہ وہ سمیرا ملک سے ملنا چاہتا ہے۔ "آپ اندر آ جائیے۔" ملازمہ نے کہا۔ وہ راشد کو ڈرائنگ روم میں لے گئی اور اسے بٹھا کر خود اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد سمیرا آئی۔ عنابی رنگ کے سوٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ راشد اسے دیکھتا رہ گیا۔

"ہیلو......... یہ اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" سمیرا نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"میرے ساتھ جانے پر تمہارے والدین کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟" اس نے سمیرا کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"ذرا بھی نہیں۔ وہ اپنی اولاد کو آزادی دینے کے قائل ہیں اور میں اس آزادی سے کبھی کوئی غلط فائدہ نہیں اٹھاتی۔" یہ کہتے کہتے سمیرا کے چہرے پر ایک سایہ لہرا گیا۔ شاید اسے مظفر کا خیال آ گیا تھا جس نے آزادی کا بدترین استعمال کیا تھا۔

"تو چلو۔"

وہ گھر سے نکل آئے۔ جناح روڈ کے ایک ریستوران میں انہوں نے کافی پی۔ وہاں سے اٹھے تو سمیرا نے پوچھا۔ "اب؟"

"اسی کیبن میں چلیں گے۔" راشد نے کہا۔

سمیرا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن انکار کیا نہ اعتراض۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ کیبن میں پہنچ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گئے۔ راشد نے سمیرا کا ہاتھ تھام لیا۔ اس لمحے راشد کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ معصومیت کے لمس سے اب تک ناآشنا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ لمس اس قدر معصوم بھی ہو سکتا ہے۔ وہ لمس اسے یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت کچھ بھی کر لے، سمیرا مدافعت نہیں کرے گی مگر وہ خود کو ایک عجیب سے بندھن میں بندھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ سمیرا کے بارے میں مختلف انداز

میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو ایک بے حد حسین، بہت ہی نازک تعلق تھا جو ان لوگوں کے درمیان چپکے سے استوار ہو گیا تھا۔ اس انداز میں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا، کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ سمیرا کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا......... اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے نزدیک اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسے یقین تھا کہ وہ پاکیزہ اور اچھوتی ہے......... بہار کی پہلی کلی کی طرح۔ اگر وہ اسے توڑ لیتا تو بھی وہ اعتراض نہ کرتی مگر وہ خود سے مایوس ہوئے بغیر نہ رہتی۔ اپنے آپ پر جو اسے مان تھا، وہ ٹوٹ جاتا اور وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے یہ سب کچھ سوچتا رہا۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ وہ اسے بغور دیکھ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "سمیرا چلو گھر چلیں۔"

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ وہ نظریں بول رہی تھیں......... بتا رہی تھیں کہ وہ اس کے تمام محسوسات کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔ پھر اس نے راشد کا ہاتھ اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے کہا۔ "شکریہ راشد......... تم بہت بہت اچھے ہو۔"

وہ باہر نکل آئے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اوپر جانے والے راستے پر قدم بڑھاتے رہے۔

"کیا تم ساری لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہو؟" سمیرا نے پوچھا۔

راشد نے شاکی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"مجھے یقین ہے تمہاری بات پر۔ سب لڑکیاں یہی کہتی ہیں کہ تم بہت سرد مہر ہو۔"

"اچھا! لڑکیاں میرے متعلق بات کرتی ہیں؟"

"تم ان کا پسندیدہ ترین موضوعِ گفتگو ہو۔"

"لڑکیوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے۔"

"سنو راشد......... میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔"

"تو تم اس بیان کے ذریعے لڑکیوں میں میری ساکھ بحال کر دو گی؟"

"ہاں میں کہوں گی، راشد بہت پیارا......... بہت اچھا ہے۔ دل کا بھی اچھا ہے اور........."

"اور پیار کرنا بھی جانتا ہے۔" راشد نے شریر لہجے میں جملہ پورا کیا۔

"ہاں یہ بھی کہوں گی۔"

"یہ تو بہت اچھا ہو گا۔"

"لیکن پھر لڑکیاں مجھے عجیب قرار دینے لگیں گی۔" سمیرا نے فکر مندی سے کہا۔

"کہیں گی' دونوں ایک جیسے ہوں گے۔ تبھی تو یہ اس کے گن گا رہی ہے۔ نہیں بھئی.......... بہتر یہی ہے کہ میں کچھ نہ کہوں۔ بس گردن اکڑائے' سر اونچا کئے پھرتی رہوں گی۔ اس انداز سے سب سمجھ لیں گے کہ کائنات میرے قدموں میں جھک آئی ہے۔"

"ہاں.......... یہ بہتر رہے گا۔"

سمیرا نے چلتے چلتے سر اس کے کندھے سے ٹکا دیا۔ "راشد.......... تم واقعی مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔" اس نے خوابناک لہجے میں کہا۔

"شکریہ۔" راشد نے کہا پھر بولا۔ "سمیرا.......... تم عام طور پر گرمیوں کی چھٹیوں میں یہاں نہیں آتیں۔ اس سال کیوں آئیں؟" پھر اس نے سمیرا کو چونکتے دیکھا تو تیزی سے بات بنائی۔ "مجھ سے ملنے؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی لیکن بدستور سنجیدہ رہی۔ اس نے راشد کے کندھے سے سر اٹھا لیا۔ "شمشیر نے بتایا تھا کہ تم یہاں کم ہی آتی ہو۔" راشد نے وضاحت کی۔

"کچھ عرصہ پہلے میرے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا۔" سمیرا نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "میں یہ سوچ کر آ گئی کہ ممکن ہے میری موجودگی میں ممی اور پاپا بہل جائیں۔" پھر وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ "لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ دونوں پینے لگے ہیں۔ پاپا نشے میں ہوتے ہیں تو غمگین ہو جاتے ہیں اور ممی نشے میں رونے لگتی ہیں۔"

"اور جب دونوں نشے میں نہیں ہوتے تو کیا کرتے ہیں؟"

"پیتے ہیں۔" سمیرا نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"اور ان کا یہ حال بیٹے کی موت کی وجہ سے ہوا ہے؟"

"نہیں۔ پیتے تو وہ پہلے بھی تھے۔ ہماری سوسائٹی میں سبھی پیتے ہیں۔ بشرطیکہ میسر آجائے۔ صرف فرق اتنا پڑا ہے کہ پہلے ڈیڈی نشے میں ہوتے تھے تو انہیں یقین ہو جاتا تھا کہ ان کا ہر نقطہ نظر درست ہے۔ جب کہ ممی کو نشے میں یقین ہو جاتا تھا کہ پاپا غلطی پر

ہیں۔ اب ممی روتی ہیں اور پاپا چپ بیٹھے رہتے ہیں۔"

"بس.......... خود پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں۔"

"میں خود رحمی کا شکار ہرگز نہیں ہوں۔ میرے بھائی نے خودکشی کی تھی۔" سمیرا کے ہاتھ پر راشد کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی جیسے وہ اسے سہارا دینا چاہ رہا ہو۔ "وہ مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔" سمیرا کہتی رہی۔ "صرف انیس سال کا تھا وہ۔ بہت ذہین' بہت خوش شکل تھا۔ تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا اس کا۔"

"مگر اس نے خودکشی کیوں کی؟" راشد نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"وہ اعصابی طور پر کمزور تھا۔ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی اس کے عزیز ترین دوست اور روم میٹ کو پسند کرتی تھی۔ میرے بھائی نے اپنے روم میٹ کی موجودگی میں خودکشی کی اور وہ خبیث تماشا دیکھتا رہا۔ اس نے مظفر کو روکنے' اسے سمجھانے کی برائے نام بھی کوشش نہیں کی۔"

"تو کیا نشے میں تھے دونوں؟" راشد کو اپنے سوال پر خود بھی حیرت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی تیسرے فرد کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ جیسے وہ جو کچھ سن رہا ہے' وہ اس کے اپنے نہیں' کسی اور کے متعلق ہو.......... اور پہلی بار سن رہا ہو۔

"نہیں وہ نشے میں نہیں تھے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مظفر نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے تو نہیں معلوم۔ کاش.......... میں تمہیں بتا سکتا۔"

"مجھے مظفر نے اپنے روم میٹ کے بارے میں اتنا بتایا تھا کہ وہ ہینڈسم لڑکا ہے اور اس کا باپ وکیل ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کبھی نہیں بتایا۔"

راشد سوچتا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال سر اٹھا رہا تھا۔ مگر اس کے خدوخال ابھی واضح نہیں تھے۔

☆======☆======☆

ٹامی کا گلا گھونٹنا راشد کے لئے ذرا بھی تکلیف دہ نہیں رہا تھا لیکن اگلے دن ہوٹل میں لوگ اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ بہت افسردہ تھے کہ ٹامی کے مقدر میں ایسی موت آئی۔ راشد کا ردِ عمل کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سب سے یوں

علیک سلیک کی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ معمول کے مطابق ہنس رہا تھا.......... بول رہا تھا.......... مسکرا رہا تھا۔ وہ ذرا بھی افسردہ نہیں لگ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے پناہ ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن راشد کی آنکھوں میں دیکھ کر انہیں بھی مایوسی ہوئی۔ انسان کتنا ہی گہرا ہو' آنکھوں میں اس کے باطن کا ہلکا سا رنگ ضرور ابھر آتا ہے۔ راشد کی آنکھوں میں کوئی رنگ نہیں تھا۔

لوگوں کے نزدیک یہ بات بہت عجیب تھی۔ وہ کتے سے بہت محبت کرتا تھا..........اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس نے ٹامی کی تربیت پر یقیناً بہت زیادہ محنت کی ہوگی۔ تو کیا اسے ٹامی سے محبت نہیں تھی؟ اس کے ردِعمل سے تو یہی ثابت ہوتا تھا۔ راشد کو اپنی طرف دیکھنے والی نگاہوں میں جو الجھن نظر آئی' وہ اس کے لئے نئی نہیں تھی۔ یہ چیز وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لوگ اس سے جذباتی ردِعمل کی توقع رکھتے تھے.......... اور وہ بھی ایک کتے کی موت پر' تو یہ ان کی حماقت تھی۔ یہ ان کی کمزوری تھی' اس کی نہیں۔ شام تک سب کو یقین ہو گیا کہ راشد پر کوئی اثر نہیں ہوا.......... اور کوئی اثر نہ ہوگا۔ چنانچہ نگاہوں کی الجھن دور ہو گئی۔

اس روز راشد نے بینک سے رقم نکلوائی اور راولپنڈی سے ایک موٹر سائیکل خرید لایا۔ شام کے وقت وہ ٹرائی کر رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر دو تین بڑے خطرناک موڑ تھے۔ وہ وہاں سے پوری رفتار سے موٹر سائیکل کو گزارتا اور اچانک بریک لگاتا کئی بار تو موٹر سائیکل سڑک سے ہٹ کر کچے میں چلی گئی۔ ایک انچ اور باہر ہوتی تو سینکڑوں فٹ گہرے کھڈے میں جا گرتی۔

راشد کے نزدیک موٹر سائیکل چلانا بھی ایک کھیل تھا اور وہ ہر کھیل پرفیکشن کے ساتھ کھیلنے کا قائل تھا۔ اس کا اصول تھا کہ اگر ٹھیک طرح سے کھیلا نہ جائے تو آدمی کھیل کو خیرباد کہہ دے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ اس نے موڑ کاٹتے ہوئے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سڑک کے کنارے سمیرا کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ راشد نے کچھ دور جا کر بریک لگائے۔ سمیرا تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی۔ راشد موٹر سائیکل پر بیٹھا رہا۔

"راشد حسن۔" اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آئندہ کبھی ایسا نہ

کرنا۔"

راشد نے موٹر سائیکل سٹینڈ پر کھڑی کی اور اس کے سامنے آ گیا۔ "کیسا نہ کروں؟" اس نے پوچھا۔

"آئندہ اس طرح موٹر سائیکل کبھی نہ چلانا۔ تم نے مجھے مرجانے کی حد تک خوف زدہ کر دیا تھا۔ آئندہ کبھی.......... کبھی ایسا نہ کرنا۔ کبھی نہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

سمیرا نے جواب میں جو کچھ کیا' وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ رسید کر دیا۔ تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ راشد لڑکھڑا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا۔ سمجھے؟" وہ غرائی۔ اس لمحے وہ بپھری ہوئی شیرنی لگ رہی تھی۔ پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے' ہوٹل کی طرف چل دی۔ راشد سناٹے کی سی کیفیت میں کھڑا رہا۔ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اسے مارا ہو.......... بالخصوص صنفِ نازک نے' اور کمال یہ تھا کہ سمیرا کی یہ حرکت اسے بری نہیں لگی تھی لیکن اس کی سمجھ میں سمیرا کا اس طرح بپھرنا نہیں آ رہا تھا۔

اس نے سمیرا کو پکارا مگر سمیرا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ دروازے پر ہی وہ اس تک پہنچ سکا۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھتی رہی۔ "میری بات تو سنو۔" اس نے کہا۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

راشد بونٹ پر کہنی ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ "تم نے تھپڑ کیوں مارا؟" اس نے پوچھا۔

"بچوں کی سی حماقت کرو گے تو تھپڑ ہی کھاؤ گے۔ دکھاوا اور بے پروائی بہت بڑی حماقت ہوتی ہے۔ تم زخمی بھی ہو سکتے تھے۔ تمہیں کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔"

"لیکن مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔"

"بس.......... ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ غصے سے بولی۔

"کیا تم میری ذمہ دار ہو۔ میری ذمہ داری اپنے سر لے رہی ہو؟" یہ سوال خود بخود راشد کے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ بالکل لے رہی ہوں۔" یہ کہہ کر سمیرا نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا

دی۔ راشد بڑی مشکل سے ہٹ پایا۔

وہ چند لمحے سر کھجاتا اور جاتی ہوئی گاڑی دیکھتا رہا۔ اس کے ساتھ اتنا عجیب رویہ کبھی کسی کا نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں.......... لیکن اسے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے دیکھ کر سمیرا خوف زدہ ہوئی تھی اور پھر غصے میں آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ سوال یہ تھا کہ اس کے زخمی ہو جانے سے سمیرا کو کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

سمیرا نے اس کے موٹر سائیکل چلانے کو دکھاوا کہا تھا.......... شو بازی سمجھا تھا۔ جب کہ وہ دکھاوے کا آدمی نہیں تھا۔ اسے کبھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ کون اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے.......... کیا سمجھ رہا ہے۔ وہ تو ہر کھیل پورے ڈھنگ سے' دیانت داری سے کھیلنے کا قائل تھا۔ وہ اعلیٰ درجے کی پرفارمنس کا قائل تھا.......... پرفیکشن کا عادی تھا۔ اس کے خیال میں اگر کوئی شخص پرفیکشن کے ساتھ موٹر سائیکل چلانے کا اہل نہیں تو اسے موٹر سائیکل چلانا ہی نہیں چاہئے اور وہ اگر چلائے تو اسی قابل ہے کہ کسی کھڈ میں گر کر مرجائے.......... کسی حادثے سے دو چار ہو جائے۔

یہ سب سوچتے سوچتے راشد کو غصہ آ گیا۔ اس سے کبھی کسی نے اس طرح بات نہیں کی تھی پھراس نے ذہن سے غصہ جھٹکا اور سمیرا کے ردِعمل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ سمیرا نے یہ کیوں سوچا کہ وہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اس کے تحفظ کی سمیرا کو کیوں فکر لاحق ہوئی۔ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ ڈر گیا۔ بات سادہ سی تھی۔ سمیرا کو اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اسے معمولی سی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے اسے خطرناک انداز میں موٹر سائیکل چلاتے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی تھی.......... مرجانے کی حد تک! ہاں.......... یہی تو کہا تھا اس نے اور یہ ردِعمل صرف اس لئے تھا کہ اسے اس کی پروا تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

وہ خود بخود مسکرایا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس کی پروا.......... اس کی فکر کی تھی۔ بچپن میں وہ بارش میں ننگے بدن باہر نکل جاتا تو کوئی اسے نہ ٹوکتا.......... نہ ممی نہ ڈیڈی۔ دوسرے بچوں کو ٹوکا جاتا۔ ان کی مائیں دانت پیس پیس کر کہتیں مردود.......... اس بارش میں بھیگے گا تو نمونیہ ہو جائے گا.......... اور بھگتیں گے ہم' لیکن لفظوں کے برعکس لہجہ بتاتا کہ انہیں بھگتنے کی نہیں' اپنے بچے کی جان کی فکر ہے لیکن ممی کبھی اس

کے لئے پریشاں نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت نہیں کی تھی۔ شاید وہ اس لئے خود کو خطرات میں ڈالنے کا عادی ہو گیا تھا کہ کبھی ممی اسے ٹوک دیں مگر ممی نے کبھی نہیں ٹوکا۔ بڑے ہوتے ہوتے یہ خواہش لاشعور میں چلی گئی اور شعور اسے پرفیکشن کے حصول کی خواہش قرار دے بیٹھا۔ عادت فطرت بن گئی۔

وہ آپ ہی آپ ہنس دیا۔ اس کی محبت میں سمیرا نے اس کی ذمے داری کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔

وہ چائے پینے کی غرض سے ہوٹل میں چلا گیا۔ وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک خاتون نے اسے پکارا۔ وہ پلٹا اور اس کی میز کی طرف چل دیا۔ خاتون بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ نیا چہرہ تھا۔ خاتون کی آنکھوں میں سرخی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ مگر دیکھنے میں وہ پچاس سے زیادہ کی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ جو مرد بیٹھا تھا' اس کی آنکھیں بھی ایسی ہی تھیں۔

"تم راشد حسن ہو نا؟" خاتون نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"میں سمیرا کی ممی ہوں.......... اور یہ اس کے پاپا۔" خاتون نے کہا پھر پوچھا۔

"چائے پیو گے؟"

"جی نہیں' شکریہ۔"

"پھر کچھ دیر بیٹھو میرے پاس۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

راشد خاموشی سے بیٹھ گیا۔

"سمیرا تمہیں بہت پسند کرنے لگی ہے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی کا تذکرہ اتنے زور و شور سے نہیں کیا تھا۔ سنا ہے کل تمہارا پالتو کتا مرگیا؟"

"جی ہاں۔"

"مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔ کتے مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔"

راشد خاموش رہا۔ خاتون اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے ذلیل کرنے کی کوشش ضرور کریں گی۔

"سمیرا کہہ رہی تھی کہ تم بہت ذہین ہو۔"

"جی ہاں۔ ذہین تو میں ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تم پر تو بہت لڑکیاں مرتی ہوں گی۔"

"ممکن ہے مرتی ہوں۔ میں بہرحال زندہ رہتا ہوں۔" سمیرا کے باپ نے چونک کر اسے دیکھا.......... اور دیر تک بغور دیکھتا رہا۔

"راشد حسن تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"وکیل ہیں۔"

"کیا نام ہے ان کا؟"

راشد نے دانستہ ملک کے مشہور ترین وکیل کا نام بتایا۔ وہ انہیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اختر ملک نے بڑی بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جب کہ خاتون کی نگاہوں سے تمسخر جھلکنے لگا۔ تاہم انہوں نے اسے کھل کر جھوٹا قرار نہیں دیا۔

"اور تم مستقبل میں کیا بننا چاہتے ہو؟"

"میں آرکیٹکٹ بننا چاہتا ہوں۔" راشد نے مضحکہ اڑانے والے لہجے میں کہا۔

لیکن اس پر کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔

"خیر راشد.......... میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ سمیرا کا خیال دل سے نکال دو۔" اچانک ہی خاتون کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ میرے دل میں سمیرا کا خیال ہے؟" راشد نے سادگی سے پوچھا۔

"سمیرا کو تم سے ملے دو دن ہوئے ہیں اور وہ ہم سے ہر وقت تمہاری باتیں کرتی رہتی ہے۔ مجھے ڈر ہے، یہ سلسلہ مزید دو ایک دن جاری رہا تو بات آگے بڑھ جائے گی۔"

"میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن اس کے دل میں کیا ہے، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" راشد نے کہا اور اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا آیا۔

☆======☆======☆

اس شام وہ پھر ملے۔ سمیرا نے سب سے پہلے اس تھپڑ کے سلسلے میں معذرت کی۔ راشد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ابھی بائیں ہاتھ کا تھپڑ باقی ہے۔"

"نہیں.......... میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی ایسا نہیں کروں گی، مجھے معاف کر دو.......... پلیز!"

"معاف کرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم جب چاہو یہ حرکت دہرا سکتی ہو۔"

سمیرا کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی۔ "راشد.......... تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا؟"

"ہاں۔ میں زندگی بھر محبت سے بچتا رہا لیکن اب اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"ٹھہرو.......... مجھے سوچنے دو۔ میں نے اس انداز میں کبھی نہیں سوچا تھا۔" راشد نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ سمیرا اسے بغور دیکھتی رہی تھی۔ وہ کچھ زیادہ دیر تک ہی سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "ہاں.......... میں نے کبھی پہلے اتنی شدت سے کوئی خواہش نہیں کی۔"

"میں نے بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے کم وقت میں کوئی کسی کے اتنا قریب بھی آ سکتا ہے۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں۔"

"مجھ سے شادی کرو گے؟"

"ہاں۔ ضرور کروں گا۔"

"کب؟"

"جب تم کہو۔"

"آج اور ابھی۔ میں اسی وقت تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

راشد بری طرح چونکا۔ "اتنی جلدی کیوں؟ اور تمہارے والدین.......... ؟"

"میں ان سے بات کر چکی ہوں۔ وہ اس پر رضامند نہیں ہیں۔"

"انہیں مجھ میں کیا برائی نظر آئی؟"

"برائی تو کوئی نہیں۔" سمیرا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ممی کہتی ہیں.......... تم اتنے خوبرو ہو کہ صرف میرے ہو کر کبھی نہیں رہ سکو گے۔ تمہاری زندگی میں لڑکیاں آتی جاتی رہیں گی۔"

"جب کہ تم جانتی ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں..........."

"ہاں۔ میں جانتی ہوں' لیکن انہیں سمجھا نہیں سکتی۔ بس تم مجھ سے شادی کر لو۔ میں ممی اور پاپا کی دی ہوئی آزادی کا غلط استعمال نہیں کر رہی ہوں۔"

"لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ فی الحال میرا کوئی مستقبل نہیں۔ میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ میں برسرِ روزگار بھی نہیں ہوں۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔ تم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہو میرے اکاؤنٹ میں خاصی رقم موجود ہے۔"

"لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ..........."

"فضول باتیں مت کرو۔" سمیرا نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "محبت میں' میں اور تُو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میں وہ کروں گی جو تم چاہو گے اور تمہیں وہ کرنا ہو گا' جو میں چاہتی ہوں۔"

راشد سوچتا رہا۔ شادی کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کجا یہ کہ اتنا بڑا فیصلہ اتنی سرعت سے کرنا۔ ان چند لمحوں میں اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا لیکن جواب بہت واضح تھا۔ اسے سمیرا پر انحصار کرنا بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ ورنہ وہ تو والدین کا سہارا لینا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

فوری طور پر شادی کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ موٹر سائیکل خریدنے کے بعد بھی اس کے پاس خاصی رقم بچی تھی۔ وہ تعلیم مکمل کر سکتا تھا۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

"میں تمہاری طرف جس طرح کھنچتی ہوں' وہ خطرناک ہے۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں تم سے آج ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری محبت کے دامن پر کوئی داغ لگے۔ میں جانتی ہوں' تم بھی اسی طرح محسوس کرتے ہو۔ ایسے میں ہم کب تک اس طرح لڑیں گے۔" سمیرا نے اسے چونکا دیا۔

راشد نے نظریں اٹھا کر سمیرا کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "تم ٹھیک کہتی ہو۔ آؤ........... چلیں۔"

☆======☆======☆

شادی کے بعد رزاق خاں کے ہوٹل میں قیام مناسب نہیں تھا۔ اس کے کاروبار پر برا اثر پڑ سکتا تھا۔ راشد نے نیچے ایک ہوٹل میں کمرا لے لیا اور رزاق خاں کو جا کر بتا دیا کہ اب وہ اس کے لیے کام نہیں کر سکے گا۔ اس نے واپس چلنے کی بھی تجویز پیش کی لیکن سمیرا کچھ روز وہیں گزارنا چاہتی تھی۔

کچھ بھی سہی۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ اختر ملک اور اس کی بیوی سعدیہ اسلام آباد واپس چلے گئے تھے۔ راشد کو ان پر ترس بھی آتا تھا۔ ایک ہی سال میں انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی گنوا دیا تھا اور اکلوتی بیٹی کو بھی اور ان کے اس دہرے زیاں کا ذمے دار ایک ہی شخص تھا........... وہ خود........... راشد نوید یا راشد حسن!

پھر دونوں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ ایک عجیب سی بے فکری اور سرشاری نے انہیں اسیر کر لیا۔ وہ دونوں ہی صحرا تھے مگر دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے دریا بھی تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہتے۔

پھر ان کے بیچ وہ دیوار آ گئی جس کے متعلق راشد نے شادی کے وقت سوچا بھی نہیں تھا۔ سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے اسے مظفر کا خیال آ جاتا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی اور سرشاری کے رنگ معدوم ہو جاتے۔ اسے خیال آتا کہ سمیرا اس سے شدید اور سچی محبت کرتی ہے اور اس محبت نے اسے کچھ حقوق دے دیئے ہیں........... وہ ان حقوق کی حد کا کبھی تعین نہ کر پاتا۔ وہ ان حقوق کے بارے میں سوچتے ہوئے خوف زدہ ہو جاتا۔ اس نے پہلے کبھی کسی کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا تھا........... دخیل ہونے کی اجازت نہیں دی تھی اور جب بھی کبھی کوئی اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے خلاف بھی دخیل ہوا تھا تو اس کا انجام دکھ اور اذیت ہی رہا تھا اور وہ دکھ سے........... اور اذیت سے ہمیشہ ڈرتا آیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اداس ہو جاتا کہ اب یہ مزاحمت اس کی فطرت میں شامل ہو چکی ہے کہ خود سے کسی کو محبت نہ کرنے دے........... اور نہ خود کسی سے نسبت کرے۔ اب زندگی میں پہلی بار اس نے اجازت دی تھی........... اس کا دل چاہتا تھا کہ سمیرا اس سے محبت کرے لیکن وہ خوف زدہ تھا کہ وہ سمیرا کو خود سے محبت نہیں کرنے دے گا۔ وہ بہت الجھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے' سمیرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے احساس ہو جاتا تھا کہ اب اس کی نگاہوں میں والہانہ پن' محبت' سرشاری اور مسرت کی جگہ اداسی

کروٹیں لے رہی ہے اور اگر سمیرا پوچھے تو وہ اس کی کوئی وضاحت بھی نہیں کر سکے گا لیکن وہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔

پھر ایک دن سمیرا نے اسے ٹوک ہی دیا۔ "راشد......... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو جاتا ہے اچانک؟"

وہ اس وقت بیڈ پر بیٹھے تھے۔ راشد اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ افق سرخ ہو رہا تھا۔

سمیرا بھی اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"چلو، ٹہلنے چلیں........" راشد نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جناح روڈ پر ٹہلتے رہے۔ سمیرا باتیں کیے جا رہی تھی لیکن راشد کا الجھا ہوا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ محض ہوں ہاں کیے جا رہا تھا۔

سمیرا کی قربت میں عجیب سا سحر اور دل آویزی تھی۔ قربت کے لمحوں میں راشد کے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہتی۔ اس وقت تو بھری کائنات میں بس وہ دونوں ہوتے۔ کبھی کسی چیز کا خیال ہی نہ آتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت نرم و گداز اور مہربان ثابت ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کو یوں برتتے جیسے وہ انسان نہیں، نازک کانچ کا آئینہ ہوں جو ایک ٹھیس سے بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ راشد کے لیے وہ جذبہ، وہ احساس بالکل ہی نئی چیز تھا۔ وہ ڈرتا کہ سمیرا کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے۔ وہ اسے کوئی مایوسی، کوئی پچھتاوا نہیں دینا چاہتا تھا مگر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ جانتا تھا اس کے دامن میں سمیرا کے لیے پچھتاووں اور اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس تصور ہی سے دہشت زدہ ہو جاتا کہ کبھی سمیرا کو اس سے کوئی تکلیف پہنچے گی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سمیرا بھی اس کو کوئی تکلیف پہنچنے کے......... تکلیف میں دیکھنے کے تصور سے ڈرتی ہے۔ وہ اسے خطرات مول لیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس دوران شمشیر سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ شمشیر اسے جادوگر قرار دیتا تھا کہ اس نے سمیرا جیسی لڑکی کو تسخیر کیا ہے۔

"کیسی گزر رہی ہے دوست؟" شمشیر نے پہلی ملاقات پر راشد سے پوچھا۔

"بہت اچھی۔ میں بہت خوش ہوں۔"

"تمہارے خوش ہونے سے زیادہ اہم سمیرا کا خوش ہونا ہے۔"

"وہ بھی بہت خوش ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ خوش ہے۔" راشد نے پوری سچائی سے جواب دیا۔

"اب تم اوپر بہت کم آتے ہو۔"

"ہم باہر کم ہی نکلتے ہیں۔"

شمشیر نے شرارت بھرا قہقہہ لگایا۔ "وہ تم پر چھا گئی ہے بری طرح........"

"اور کمال یہ ہے کہ یہ مجھے برا نہیں لگتا۔"

"اور اب تم اس کے لئے بڑے آدمی بھی بنو گے۔"

"بڑا آدمی تو میں ہوں۔" راشد نے سینہ پھلا کر کہا۔

اسی وقت سمیرا بھی آ گئی۔ "کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

"شمشیر کہتا ہے کہ تم سے شادی کے لیے میرا بڑا آدمی ہونا ضروری ہے۔ پہلے نہیں بن سکا تو اب بن جانا چاہیے۔" راشد نے اسے بتایا۔

"راشد اب بھی بڑا آدمی ہے۔ مستقبل میں اور بڑا ہو جائے گا۔" سمیرا نے شمشیر سے کہا۔

"یہ درست ہے۔ بڑا آدمی نہ ہوتا تو تم سے شادی کیسے کرتا۔" شمشیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے بعد سمیرا نے راشد سے پوچھا۔ "تم اس سے ذاتی گفتگو تو نہیں کرتے......... خاص طور سے میرے متعلق؟"

"ہرگز نہیں۔ کر بھی نہیں سکتا۔ ویسے بھی یہ خُو تم لڑکیوں ہی میں ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ بہرحال تم اس سے کبھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں بھی کسی سے نہیں کرتی۔ ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہے، میں اسے ایک حسین اور مقدس راز کی طرح رکھنا چاہتی ہوں۔ طلوعِ آفتاب کا جو منظر ہم دیکھتے ہیں، پھولوں کی جو مہک ہمارے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے، ہوا کے جھونکے جو ہمیں چھوتے ہیں......... اور ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے جو کچھ کہتی ہیں......... یہ سب حسین اور مقدس راز ہیں۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔ بس یہ میرے اور تمہارے لیے ہیں۔ ہمارے درمیان ہیں۔ میں ان کا شائبہ بھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ تم بھی نہ دینا۔" وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

سمیرا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ راشد جانتا تھا کہ اس وقت وہ اس کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس نے سمیرا کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑی نرمی سے اس کی پیشانی پر آئے ہوئے بال ایک طرف ہٹا دیئے۔

کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "جانتے ہو' میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔"

"کیا سمجھ گئیں؟" راشد کے دل میں وسوسے جاگ اٹھے۔

"میں تمہیں پوری طرح سمجھ گئی ہوں راشد حسن۔"

وہ مسکرا دیا لیکن اس مسکراہٹ میں خوشی نہیں تھی۔

"تم سننا چاہو گے؟" سمیرا نے پوچھا۔

"ہاں.......... کیوں نہیں۔"

"میں نے جان لیا ہے کہ تم بے حد حساس ہو۔ تکلیف دہ حد تک حساس! وہ حساسیت اتنی شدید اور بے پناہ ہے کہ تمہیں اذیت دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ تم بہت زیادہ محسوس کرتے ہو.......... اور بہت زیادہ گہرائی میں محسوس کرتے ہو۔ اتنی گہرائی میں کہ تمہیں محسوس کرنے سے ڈر لگتا ہے۔ تمہیں محبت کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ محبت بہت اذیت دیتی ہے۔ دوسرے لوگ محبت کرتے ہیں اور محبت کی دی ہوئی اذیت سہہ بھی لیتے ہیں لیکن تم اتنے احساس ہو کہ سمجھتے ہو' وہ اذیت تمہیں مار ڈالے گی۔ ٹامی سے محبت کرنا تمہاری ضرورت تھی مگر تم اس سے محبت نہ کر سکے۔ تم جانتے تھے کہ وہ کتا ہے اور ایک نہ ایک دن مر جائے گا۔ تم جانتے تھے کہ محبت کی صورت میں تم اس کی موت برداشت نہیں کر سکو گے۔ تم سے تو اپنے محبوب کتے کی موت بھی برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی محبوب ہستی کی موت کا صدمہ تو تم جھیل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے تم نے کسی کو محبوب نہیں ہونے دیا۔ ابھی چند روز پہلے تم نے اپنے کتے کا اپنے ہاتھوں گلا گھونٹا۔ یہ بہت بہادری کا کام تھا.......... شریفانہ بھی اور دشوار بھی۔ تم اس مرحلے سے صرف اس وجہ سے گزر گئے کہ کتے کے لیے تمہارے دل میں

محسوسات ذرا بھی نہیں تھے۔"

راشد خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ سمیرا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"تم اس بچے کی طرح ہو جو ماں باپ کے غصے اور پٹائی سے بچنے کے لیے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہے۔ تم تعلقات قائم کرنے سے گریز کرتے ہو کیوں کہ تمہیں خوف ہے کہ تعلقات کسی بھی وقت تمہارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ تم محسوسات سے ڈرتے ہو کہ اگر تم نے ایک بار انہیں اپنا لیا تو انہیں پابند نہ کر سکو گے.......... حدود میں نہ رکھ سکو گے۔ وہ تم پر حاوی ہو جائیں گے۔ تم نے اپنے گرد غیر جذباتیت کا حصار قائم کر رکھا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جب تک تم اس حصار میں ہو' محفوظ و مامون ہو۔"

راشد نے دل ہی دل میں کہا.......... "مگر اب تو وہ حصار ٹوٹ چکا ہے۔"

"ہر شخص تمہیں سرد مزاج اور تنہائی پسند سمجھتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتی۔ میں جانتی ہوں' تم دنیا کے حساس ترین آدمی ہو۔"

راشد نے پھر بھی کچھ نہیں کہا۔ نہ اس نے اتفاق کیا نہ اختلاف۔ سمیرا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے منہ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

راشد نے اس کا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں نے.......... مسکراہٹ نے سمیرا کو جواب دے دیا تھا کہ اس نے جو کچھ کہا درست ہے۔

☆======☆======☆

راشد زندگی میں اتنا خوش کبھی نہیں رہا تھا مگر پہلے کبھی اس نے کسی سے محبت بھی تو نہیں کی تھی۔ اسے ہر لمحے زندگی پر فتح مندی کا احساس ہوتا رہتا تھا۔ سمیرا بہت پیاری لڑکی تھی۔ محبت کرنے والی' نرم خو گداز طبیعت اور خوب صورت۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اسے سمجھتی تھی.......... جانتی تھی۔ ورنہ اسے تو اس کے والدین نے بھی کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی اپنے آپ سے اتنا واقف نہیں تھا۔ بہت سی باتیں تو اب سمجھ میں آ رہی تھیں۔ ماں نے ہمیشہ اس سے سرد مہری برتی تھی۔ محبت کی بھی تو اس کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ اور پھر اس کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی ماں'

اس کے باپ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ یوں وہ صرف ماں کے احترام ہی سے محروم نہیں ہوا باپ کا احترام بھی گیا........... اور صنفِ نازک کا احترام بھی۔ اب اسے خیال آتا تھا کہ اس نے صنفِ نازک پر اعتبار نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ اپنی وجاہت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے کھلونے کی طرح استعمال کیا........... اس کی تحقیر کی۔ وہ جو ماں کو سزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا‘ اس کی صنف کو پیہم سزا دیتا رہا اور اب وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا۔ صرف گرفتار نہیں‘ اسے ایک لمحے کے لیے بھی بے اعتباری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کے نزدیک بے حد محترم تھی۔ وہ اسے کوئی دکھ‘ کوئی تکلیف دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سمیرا نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ عمر بھر خود کو سمجھنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اسے اس بات کا احساس پہلے کیوں نہیں ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ سمیرا کی طرف اس طرح کیوں کھنچا۔ یہ کیفیت پہلے کبھی کسی اور لڑکی کے ساتھ کیوں نہیں ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان یہ کیسا تعلق استوار ہوا تھا۔ ایک جادو سا تھا۔ محبت‘ ایک دوسرے کی فکر‘ انڈر اسٹینڈنگ........... اور یہ سب کچھ بغیر کسی کوشش کے ہوا تھا۔ خود بخود ہوا تھا........... جیسے پہلے سے موجود ہو اور وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نافہمی اسے بری طرح الجھا رہی تھی جو کچھ ہوا تھا غیر منطقی تھا........... لیکن بہت اچھا........... بہت خوب صورت بھی تھا۔

پہلے وہ بھوک کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا مگر اب بھوک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک لگ بھی زیادہ رہی تھی۔ بعض اوقات کھانا کھانے کے آدھے گھنٹے بعد پھر بھوک لگتی تھی۔ دس دن میں اس کا وزن تین پونڈ بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بھاری لگنے لگا۔ جسمانی فٹنس کا خیال ایک طرف رکھا رہ گیا۔ سمیرا نے اسے عجیب سا احساسِ تحفظ دیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ وہ موٹا اور بھدا ہو جائے‘ تب بھی سمیرا اس سے اسی طرح محبت کرے گی اور یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا اور اجنبی تھا۔

لوگ اس کے بارے میں کس انداز میں سوچتے ہیں........... اس کی اسے کبھی پروا نہیں رہی تھی۔ اب بھی نہیں تھی مگر اسے اپنے بارے میں سمیرا کے خیالات اور اس کی رائے کی پروا تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ سمیرا پر اس کی شخصیت کا کوئی ناگوار تاثر مرتب ہو۔ اسے کبھی یہ خیال آتا کہ سمیرا کبھی کسی بات پر اسے برا سمجھے گی تو اس کی

اذیت کی کوئی حد نہ رہتی۔

وہ سوچتا کہ سمیرا کو کبھی نہیں بتائے گا اس نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے........... کتنی زیادتی کی ہے۔ وہ راشد نوید نامی ایک شخص سے نفرت کرتی تھی اور وہ نفرت معقول اور فطری تھی۔ اور وہی راشد نوید‘ راشد حسن بن کر اس سے ملا تھا........... اور وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی لیکن وہ محبت سمیرا کے دل سے راشد نوید کی نفرت کو نہیں دھکیل سکی تھی۔ دونوں متصادم جذبے اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو مٹا سکتا تھا تو وہ صرف اور صرف محبت تھی۔

راتوں کو سمیرا کے سو جانے کے بعد وہ جاگتا اور پریشان رہتا........... وہ سمیرا کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک دن اسے سمیرا پر یہ راز کھولنا ہو گا اور راز جتنی دیر میں کھلے گا‘ اذیتیں اور پیچیدگیاں اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی بات سے ڈر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ہر صورتِ حال کا پوری طرح تجزیہ کرنے کا قائل تھا اس طرح بے خبری دور ہو جاتی تھی اور صرف حقائق اس کے سامنے ہوتے تھے۔ جب کہ اس وقت وہ ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھا جہاں ہر چیز نامعلوم تھی........... ہر بات معما تھی۔ سب کچھ جاننے پر سمیرا کیا ردِ عمل ہو گا؟ کیا وہ اسے معاف کر سکے گی؟ وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ باقی ہر بات تو سمیرا نے سمجھ لی۔ ممکن ہے‘ یہ بات بھی سمجھ جائے لیکن یہ محض ایک امکان تھا۔ اب وہ خود کو ولن محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنا وجود برا لگنے لگا تھا۔

اس عرصے میں سمیرا نے ایک بار اور اس کی کھنچائی کی تھی۔ وجہ وہی تھی........... پرانی وجہ۔ موٹر سائیکل چلانے میں بے پروائی اور شوبازی۔ راشد نے فوراً ہی معذرت کر لی تھی........... اور دل سے تائب بھی ہو گیا تھا۔

اس کا یہ اندازہ بھی درست نکلا کہ وہ ٹینس کھیلتی ہے۔ ایک دن وہ مری کلب گئے اور انہوں نے ٹینس کھیلی۔ سمیرا کی سروس بہت اچھی تھی۔ ورنہ لڑکیاں عموماً اچھی سروس سے محروم ہوتی ہیں۔ کھیل کے معاملے میں وہ اس کے یونیورسٹی کے ساتھیوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ اس کی ریٹرن بہت تیز‘ اچھی اور ذہانت سے بھرپور ہوتی تھی........... دھوکا دینے والی۔ راشد کو اس کے ساتھ کھیل کر خوشی ہوئی‘ کئی مہینوں سے

وہ اتنی اچھی ٹینس نہیں کھیل سکا تھا۔ جب کہ اسے اس کھیل سے عشق تھا۔ سمیرا بہت اچھا کھیل رہی تھی۔ راشد کی اچھی خاصی ورزش ہو گئی' اور سمیرا بہت سنجیدگی سے کھیل رہی تھی.......... جیتنے کے لیے! راشد نے زندگی میں پہلی بار خوشی سے اپنی شکست قبول کی.......... اور اسے وہ شکست بہت اچھی بھی لگی۔ سمیرا کو خوش دیکھ کر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ بظاہر مقابلہ بہت سخت ہوا۔ دونوں کی رفتار میں زیادہ فرق نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا' راشد کے جیتنے کے لیے بہت کافی تھا مگر راشد نے سمیرا کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیا۔ سمیرا کے جیتنے پر شمشیر نے خوب تالیاں پیٹیں۔

سمیرا اپنے گھر' اپنے والدین کے بارے میں کثرت سے گفتگو کرتی تھی۔ وہ اسے اپنے اسلام آباد والے گھر کے متعلق بتاتی۔ وہ بڑی صاف گوئی اور سچائی سے سب کچھ بتاتی.......... اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ سب کچھ راشد کے سینے میں محفوظ رہے گا۔ کئی بار اس نے مظفر کی موت کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ راشد خاموشی سے مگر دلچسپی کے ساتھ سنتا لیکن وہ اپنے بارے میں کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے.......... اپنے پس منظر کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس میں حوصلہ نہیں تھا اور پھر بتانے کو بھی بہت کچھ تھا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ راشد کو مظفر کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ اسے خط لکھتا.......... بتاتا کہ وہ کتنا خوش ہے۔ کتنا اچھا وقت گزر رہا ہے۔ وہ مظفر سے دل کی بات' اپنے خیالات اور اپنے خواب سنانے سے کبھی نہیں ہچکچایا تھا۔ ویسے ان دونوں کے درمیان خط و کتابت کم ہی ہوتی تھی لیکن وہ جب بھی خط لکھتے وہ دل کی باتوں سے عبارت ہوتا۔ کیا سوچا جا رہا ہے.......... کیا دیکھا جا رہا ہے۔ کیا کیا جا رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب تھے.......... اور ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے تھے۔ اسی لیے راشد کو حیرت تھی کہ مظفر نے اس سے ثمینہ کے بارے میں کیوں بات نہیں کی۔ شاید وہ سمجھ بیٹھا ہو کہ وہ ثمینہ میں دلچسپی رکھتا ہے حالانکہ راشد نے بارہا واضح کر دیا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔

اب راشد اپنی زندگی کے خوش گوار ترین دنوں کے بارے میں کسی کو بتانا چاہتا تھا تو پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے عزیز ترین دوست کو کھو بیٹھا ہے۔ اب وہ کسے بتاتا اور کیسے بتاتا کہ وہ خود کو ہیرو نہیں' ولن محسوس کرتا ہے.......... اور یہ کہ اسے جو

خوشیاں ملی ہیں' وہ ان کا حق دار نہیں تھا.......... نہیں ہے۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آتی بھی تو کیسے؟ جس لڑکے کی خودکشی کے بارے میں بات کرتے کرتے سمیرا دکھی ہو جاتی' وہ صرف راشد کا دوست نہیں تھا' سمیرا کا بھائی بھی تھا۔ سمیرا اس سے.......... راشد حسن سے محبت کرتی تھی لیکن وہ راشد نوید سے نفرت بھی تو کرتی تھی اور راشد نوید.......... ولن وہ خود تھا۔

راشد دل کا یہ بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرنا چاہتا تھا مگر اس کی زندگی میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ ایک تھا تو اسے اس نے خود گنوا دیا تھا اور دوست اس نے بنائے ہی کب تھے؟ کون اسے سمجھاتا کہ اس گتھی کو کیسے سلجھایا جائے.......... ؟ اس نے مظفر کی خودکشی کی وجہ سمجھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بے سود ثابت ہوئی۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید سمیرا اس سلسلے میں زیادہ جانتی ہو.......... کچھ مدد کر سکے.......... معلومات فراہم کر سکے مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود کو ایک تنگ دائرے میں گھومتا محسوس کرنے لگا۔ وہ سمیرا کو زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقع دیتا.......... اور اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہتا.......... اس امید پر کہ شاید کبھی سمیرا کی زبان سے عقدہ کشا جملہ ادا ہو جائے لیکن اس کی معلومات میں کبھی کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

اسے خود سے مایوسی بھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکے گا.......... نہیں کرے گا مگر اسے محبت ہو گئی تھی۔ نہ صرف ہو گئی تھی بلکہ وہ محبوب ہستی اس کے مرحوم دوست مظفر کی بہن تھی.......... اور مظفر کی موت سے اس کا خود کا گہرا تعلق تھا۔ اب وہ مظفر کی خودکشی کے سلسلے میں سمیرا کا نقطہ نظر سمجھنا چاہتا تھا مگر اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی۔

بالآخر ایک دن اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہا تھا۔ وہ جو محبت کا قائل بھی نہیں تھا اور اہل بھی نہیں تھا اسے سمیرا نے وہ محبت دی تھی جس کا کوئی بدل نہیں تھا اور وہ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ اس نے اس سے چھپایا تھا کہ وہ درحقیقت وہ شخص ہے جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ فریب کے سہارے زندگی گزار کر خوش نہیں رہا جا سکتا۔ کون جانے کتنی عمر پڑی ہے۔ آدمی تمام عمر تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔

چنانچہ اس نے خود ہی اپنے فریب کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا..........

☆======☆======☆

اس روز وہ بہت چپ چپ تھا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ جیسے طبیعت خراب ہو۔ سمیرا نے دو ایک بار اسے پکارا مگر اس نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج سمیرا کو سب کچھ بتا دے گا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی سنجیدگی اور چہرے کے سنگین تاثر نے سمیرا کو خوف زدہ کر دیا ہے۔ سمیرا کے چہرے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود کو کسی انہونی کے لیے تیار کر رہی ہے۔ حالانکہ وہ نوعیت کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتی تھی۔

راشد کو احساس تھا کہ جو کچھ اسے کہنا ہے' وہ بے حد دشوار ہے۔ کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر بولا۔ "سمیرا.......... جانتی ہو' میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم ہر بات سے پہلے اور ہر بات کے بعد اس حقیقت کو یاد رکھو۔ یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لیے بھی کہ میں نے اس سے پہلے یہ لفظ کبھی کسی سے نہیں کہے.......... کسی سے بھی نہیں کہے۔ نہ ہی میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کی تھی۔ میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں.......... اتنی کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

سمیرا جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' لفظ بہ لفظ درست ہے۔ "میں جانتی ہوں راشد اور یہ محبت میری زندگی کا حاصل ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن مجھے ایک خوف ناک بات بتانا ہے تمہیں۔"

یہ تجسس اب سمیرا کے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ راشد نے بہت آہستگی سے.......... ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "سمیرا.......... میرا نام راشد نوید ہے۔"

"مجھے معلوم.........." وہ کہتے کہتے رکی۔ اس کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ پھر جیسے اچانک اس کے اعتراف کی.......... اس جملے کی اہمیت اور معنویت اس پر واضح ہوئی۔ "اوہ مائی گاڈ..........! تم.......... تم راشد نوید ہو.......... مظفر کے دوست!" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ راشد کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔

راشد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

"سمیرا.......... تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟" راشد گڑگڑایا۔ "تم نے مجھے دوسروں سے بہتر سمجھا ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں' مجھے معاف نہیں کر سکتیں؟"

"مجھے یقین نہیں آتا.......... میں یقین نہیں کر سکتی۔" وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑانے لگی۔

راشد اسے روتے' ہچکیوں کی لے پر اس کے لرزتے جسم کو بیڈ پر بکھرتے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے اپنے جسم میں سے زندگی دھیرے دھیرے نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کا دکھ پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ حالاں کہ اس نے کبھی خود کو بھی پوری طرح نہیں سمجھا تھا.......... نہیں محسوس کیا تھا۔ وہ مجرم تھا۔ اسے خود پر شرم آ رہی تھی۔ کاش' زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کی سسکیاں سنتے سنتے اس نے خود اپنی زبان دانتوں سے کاٹ ڈالی۔ وہ اس وقت کوئی بہت بڑی تکلیف اٹھانا چاہتا تھا.......... تاکہ ضمیر کا بوجھ کچھ کم ہو جائے مگر زبان پر خون کے نمکین ذائقے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تو اسے اذیت دینے سے مر جانا بہتر سمجھتا تھا۔

سمیرا اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے سوٹ کیس پیک کرتے دیکھتا رہا مگر نہ منہ سے کچھ بولا نہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اس کا جسم جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ وہ سوٹ کیس پیک کر کے کمرے سے نکلی تو وہ اس کے پیچھے لپکا۔ وہ لاری اڈے کی طرف جا رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو سمیرا؟"

"میں گھر واپس جا رہی ہوں۔" سمیرا نے رکے بغیر جواب دیا۔ اس کی آواز چیخ رہی تھی۔ وہ کسی سہمی ہوئی ننھی سی بچی کی آواز تھی۔ اس آواز نے راشد کا دل چیر ڈالا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا راشد؟ تم یہاں کیوں آئے؟ تم نے مجھے اپنی محبت میں کیوں الجھایا؟ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

راشد کی آواز لرز رہی تھی سڑک پر نظریں جمانا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔ سمیرا یقین کرو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں ہو گا۔ سمیرا میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے قدم قدم چلتے رہے۔ سمیرا چپکے چپکے روئے جا رہی تھی۔ راشد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مر جائے.......... یہیں.......... اسی وقت!

"تم کبھی مجھے معاف نہیں کر سکو گی؟" راشد نے چلتے چلتے کہا۔

"ممکن ہے راشد' میں تمہیں معاف کر دوں لیکن میں نے ایسا کبھی کیا تو میں کبھی خود سے بھی نہیں مل سکوں گی.......... اپنے ساتھ کبھی نہیں رہ سکوں گی۔"

سمیرا پنڈی جانے والی ویگن میں بیٹھ گئی۔ راشد خاموش کھڑا اسے تکتا رہا۔ وہ اس سے نظریں چراتی رہی۔ راشد اس سے کہنا چاہتا تھا کہ واپس آ جاؤ.......... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ لیکن وہ کس منہ سے کہتا۔

ویگن چلی گئی۔ وہ موڑ مڑنے تک خالی خالی نظروں سے اسے تکتا رہا۔ پھر پلٹ کر واپس چل دیا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب توڑ پھوڑ مچائے۔ کانچ کی چیزیں توڑ ڈالے بلکہ دنیا ہی کو تہس نہس کر دے۔ وہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا اس نے سانسیں ہموار کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر ناکام رہا۔ بے ترتیب سانسیں ان تیز ہواؤں کی طرح تھیں جو گھنے درختوں کی شاخوں سے الجھ کر شور مچاتی ہیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے لیکن سانسوں کا زیر و بم وہی رہا.......... جسم ویسے ہی لرزتا رہا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ ٹھنڈے پانی سے نہایا۔ جسم بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ پیٹ کے بل بستر پر گر کر رونے لگا۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ کبھی رویا ہو۔ آنسوؤں کا ذائقہ لبوں پر.......... اور زبان پر بے حد عجیب اور نامانوس لگ رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتا رہا..........

☆======☆======☆

اگلے روز شمشیر اس سے ملنے آیا تو وہ بستر پر اسی طرح پڑا تھا۔ نیم جاں۔ اسے بستر پر گرے ہوئے بیس گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اس نے نہ کچھ کھایا تھا' نہ کچھ پیا تھا۔ نقاہت اتنی زیادہ تھی کہ اٹھنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ شمشیر اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا لیکن اسے کام پر جانا تھا۔ اس نے چھٹی کرنا چاہی لیکن راشد نے اسے سختی سے منع کر دیا۔

"سمیرا کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا۔

"وہ کچھ دن کے لیے اسلام آباد چلی گئی ہے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں؟"

"گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے!"

شمشیر مطمئن تو نہیں ہوا تاہم چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد راشد بستر پر لیٹا رہا۔ کمزوری بہت زیادہ تھی۔ وجود میں عجیب سی تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے خود کو اتنا کمزور' اتنا مردہ کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ روحانی تھکن تھی جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

دوپہر کے قریب وہ اٹھا۔ بھوک اب بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کبھی کھڑکی میں جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اس نے کہانیوں کا ایک مجموعہ اٹھایا اور اسے پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پھر وہ جا کر سگریٹ کا پیکٹ خرید لایا۔ وہ سگریٹ باقاعدگی سے نہیں پیتا تھا مگر انتشار کے عالم میں سگریٹ سے بڑی مدد ملتی تھی۔ اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔

شام کے وقت اس نے تھوڑا سا کھانا زہرمار کیا۔ پھر وہ موٹر سائیکل لے کر نکل کھڑا ہوا۔ کچھ دیر وہ بے مقصد موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ پھر اس نے رزاق خان کے ہوٹل کا رخ کیا۔ اسے احساس تھا کہ وہ سمیرا کے گھر جانا چاہتا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بے سود ہو گا۔ سمیرا اس کے پاس سے گئی تھی تو وہ بہت برے حال میں تھی۔ اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ تقریباً ہسٹریائی سی کیفیت تھی اس نے جا کر یقیناً اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا ہو گا۔ بات اگر سمیرا کی حد تک رہتی تو یقیناً بہتری کی کوئی صورت نکل آتی۔ وہ جانتا تھا کہ اختر ملک اور سعدیہ ملک سب کچھ جاننے کے بعد سمیرا کو اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھنے دیں گے۔ وہ اسے کبھی سمیرا سے ملنے نہیں دیں گے.......... کبھی بات نہیں کرنے دیں گے۔

لیکن وہ سمیرا کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ سمیرا ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں۔ وہ اس صدمے سے کس انداز میں گزر رہی ہے۔ کیا گزر رہی ہے اس پر۔ وہ سوچتا رہا کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ وہ شمشیر سے فون کروا سکتا تھا لیکن اس صورت میں سمیرا فوراً سمجھ جائے گی کہ درحقیقت بات وہ کرے گا۔

اس کے باوجود اس نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شمشیر کو فون کرنے پر رضامند کر لیا۔

"میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔" شمشیر نے کہا تاہم وہ فون کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ سمیرا نے شمشیر کا نام سنتے ہی فون رکھ دیا۔

راشد کا اندازہ تھا کہ سمیرا کو سنبھلنے کے لیے کم از کم دو ہفتے کی مہلت درکار ہوگی۔ پھر وہ شاید اس سے ملنا گوارا کر لے لیکن دو ہفتے سمیرا کے بغیر گزارنے کا تصور بھی اس کے لیے جان لیوا تھا۔ اس کی مضبوط زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا۔ پہلے اس نے زندگی میں کبھی کوئی کام بے قاعدگی سے نہیں کیا تھا۔ وہ زندگی میں نظم اور ترتیب کا قائل تھا لیکن اب تو اسے خود پر اختیار ہی نہیں رہا تھا۔ کسی کی بات سنتا تو بے دھیانی سے.......... اور خود کوئی بات ہی نہ کرتا۔ زیادہ وقت تنہا بیٹھا خلاؤں میں گھورتا رہتا۔

شمشیر کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن شمشیر سمجھتا تھا کہ راشد اور سمیرا کے درمیان کوئی بہت بڑی بات ہو گئی ہے لیکن ظاہر ہے' وہ وجہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی اس کی سمجھ سے بہت زیادہ بالاتر تھی۔ تاہم وہ راشد کا دل بہلانے کی بھرپور کوشش کرتا تھا۔

ایک دن وہ راشد کو مری کلب لے گیا۔ اس نے لوگوں کو ٹینس کھیلتے بارہا دیکھا تھا مگر خود کبھی کھیلا نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے راشد کی خاطر اس سے کھیلنے پر اصرار کیا۔ وہ شور مچاتا' چہکتا رہا لیکن اس کا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔ راشد بے دلی سے کھیلتا رہا جیسے الٹا شمشیر کا دل رکھ رہا ہو۔ پھر اس نے جھنجلا کر ریکٹ ایک طرف پھینک دیا۔

اس شام شمشیر اس کے کمرے میں رات بارہ بجے تک بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ راشد اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے مگر جب وہ تھک ہار کر اپنے ہوٹل کی طرف واپس چلا' تب بھی اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

اب راشد کا صرف ایک ہی رفیق تھا.......... اس کی موٹر سائیکل۔ وہ موٹر سائیکل اٹھاتا اور کسی بھی طرف نکل جاتا۔ وہ نتھیا گلی تک ہو آیا لیکن اس نے دیکھا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ نتھیا گلی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ کھانے پینے کی اسے بالکل پروا

نہیں رہی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ورزش بھی چھوڑ دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ بہت کمزور لگنے لگا تھا۔

دو ہفتے کا عرصہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ آدھا سیزن ختم ہو چکا تھا۔ بیشتر ہوٹل بند ہو چکے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا طاری رہنے لگا۔ شمشیر بھی واپس چلا گیا تھا۔ کوئی تنہائی سی تنہائی تھی۔ ان دس بارہ دنوں میں اگرچہ اس نے کسی سے تعلق نہیں رکھا اور پھر یہ کہ بنیادی طور پر وہ تنہائی پسند بھی تھا۔ اس کے باوجود تنہائی سے اب اسے وحشت ہونے لگی تھی۔

سوچنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ خود کو بدترین نتائج کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنے تمام جذبے' تمام تعلقات' تمام اہم لوگوں کی شخصیات ذہن کے نہاں خانوں سے نکال کر اپنی گود میں پھیلا کر بیٹھ جاتا تاکہ ان کا تجزیہ کر سکے' ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترجیحات کا تعین کر سکے۔ ممی' ڈیڈی اور اختر ملک' سعدیہ ملک اور سمیرا ملک' جو اب سمیرا راشد تھی۔ سمیرا نے بتایا تھا کہ ان کے ہاں گھریلو جھگڑے بکثرت ہوتے تھے۔ دو ایک بار تو اختلافات بہت ہی شدید ہو گئے تھے۔ تاہم راشد کے اپنے والدین کے برعکس سمیرا کے والدین جدا جدا زندگی گزارنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخیل ہوتے تھے۔ راشد فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کے والدین بہتر ہیں یا سمیرا کے۔ اس کے گھر کا ماحول زیادہ اچھا ہے یا سمیرا کے گھر کا۔

تاہم اس کا خیال تھا کہ مظفر کی موت کے سلسلے میں اس کے والدین احساسِ جرم کا شکار تھے۔ انہوں نے بھی اس کے والدین کی طرح اپنے بیٹے کو توجہ' محبت اور شفقت سے محروم رکھا تھا۔ وہ بس صرف ضروریات پوری کر دینے کو محبت کا نام دیتے تھے۔ چنانچہ مظفر کی موت کے بعد انہیں احساسِ جرم ستاتا ہو گا مگر اب اگر سمیرا نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا تو انہیں اپنے احساسِ جرم سے چھٹکارا پانے کی سبیل نظر آ گئی ہو گی۔ انہیں اس کی صورت میں وہ کندھا مل گیا ہو گا جس پر اپنا بوجھ.......... اپنا احساسِ جرم لاد کر خود ہلکا پھلکا ہوا جا سکے۔

مگر تجزیئے سے اسے حاصل کچھ نہیں ہوا۔ صورت حال کی پیچیدگی اپنی جگہ تھی۔ اس کی سنگینی کسی طور کم نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے احساس شکست بھی ستاتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت نرم پڑتی جا رہی تھی۔ یہ وہ شکست تھی جس کا کبھی اس نے تصور

بھی نہیں کیا تھا۔

☆======☆======☆

دو ہفتے تک اس نے کسی طرح خود کو باندھے رکھا۔ دو ہفتے پورے ہوتے ہی اس کا ضبط جواب دے گیا۔ سمیرا کا اسلام آباد والا پتا اس کے پاس تھا۔ شام کو اس نے موٹر سائیکل نکالی اور اسلام آباد کی طرف چل دیا۔

اختر ملک کا بنگلا شہر کے جس سیکٹر میں تھا' وہ ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ راشد وہاں پہنچا تو بوندا باندی شروع ہو گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے بادل زور سے برس پڑے۔ راشد نے موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور گیٹ کی طرف لپکا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ خاصا بھیگ گیا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اسے دھکیلا اور تیز قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اب وہ بارش سے بہرحال محفوظ تھا۔

گھنٹی کے جواب میں ایک خادمہ نے دروازہ کھولا۔ وہ ہچکچائی لیکن اس کا پُراعتماد انداز دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور اسے راستہ دے دیا۔ پھر اس نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کیا۔

سمیرا اور اس کی ماں آتش دان کے قریب والے دیوان پر بیٹھی تھیں۔ اختر ملک ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ دروازے کی طرف اس کی پشت تھی۔ کمرا بے حد وسیع و عریض تھا اور بہت خالی خالی لگ رہا تھا۔

سمیرا اور سعدیہ نے فوراً ہی راشد کو دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر اختر ملک نے بھی پلٹ کر اسے دیکھا۔ راشد کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ اپنی زندگی کے بدترین انسانی رویئے کا............ خوف ناک ترین تجربے کا سامنا کرنے والا ہے۔ اسے احساس ہو گیا کہ اسے پوری شدت سے رد کیا جائے گا لیکن وہ منہ نہیں چھپا سکتا تھا۔ اسے حقائق کا سامنا کرنا تھا۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اسے یہ کرب ان تینوں کی خاطر سہنا ہو گا۔ اس سے انہیں فائدہ ہو گا۔ وہ ہلکے ہو جائیں گے۔ ان کے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ اس پر جذبات کے تھپڑ برسنے والے ہیں۔ اسے نفرت کا سامنا کرنا ہے۔ اس نے خود کو اس رول کے لیے تیار کر لیا تھا جو اسے ادا کرنا تھا۔ پھر اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ اس کرب سے اسے بھی کچھ حاصل ہو گا یا نہیں۔ پھر اس نے سوال کو ذہن سے

جھٹک دیا۔ کچھ ملے یا نہ ملے۔ اس سے تو بہرحال گزرنا ہے۔ وہ راضی بہ رضا ہو گیا۔

اختر ملک اتنی تیزی سے اٹھا کہ کرسی الٹ گئی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ غرایا۔

"میں سمیرا کو دیکھنے آیا ہوں کہ یہ خیریت سے ہے یا نہیں۔" راشد نے نرم لہجے میں کہا۔

سمیرا اور سعدیہ اپنی جگہ بیٹھی اسے یوں تکے جا رہی تھیں جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو............ پھر سعدیہ نے یوں سمیرا کا ہاتھ تھاما جیسے اسے کسی آفت سے بچانا چاہ رہی ہو............ احساسِ تحفظ فراہم کر رہی ہو۔ سمیرا نے آنکھیں موند لیں۔

"سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" اختر ملک نے چیخ کر کہا۔

راشد سمیرا کو بغور دیکھتا رہا۔ وہ بے حد کمزور اور زرد ہو گئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے تھے۔ "یہ فیصلہ سمیرا ہی کو کرنے دیں کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے یا نہیں۔"

"میں جو تمہیں بتا رہا ہوں۔ سمیرا تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" اختر ملک کی آواز بلند ہو گئی۔ "تم اسی وقت نکل جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ۔"

راشد کو اس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے دکھائی دیے۔ اسے ہلکی سی حیرت ہوئی۔ اتنے شدید ردِعمل کی تو اسے توقع بھی نہیں تھی۔

"تم بہت خبیث ہو............ ذلیل۔" سعدیہ ملک نے کہا۔ وہ اب سمیرا کا ہاتھ تھپتھپا رہی تھی۔

"بس............ نکل جاؤ یہاں سے۔ ہم تمہیں ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔" اس بار اختر ملک نے چنگھاڑ کر کہا۔

"سمیرا!" راشد نے پکارا۔

سمیرا نے سر اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "راشد............ تم چلے جاؤ۔ میں اب تمہیں کبھی نہیں دیکھنا چاہتی............ کبھی نہیں ملنا چاہتی تم سے............" اس کے لہجے میں دکھ تھا۔ اس نے یوں رک رک کر الفاظ ادا کیے تھے جیسے انہیں ادا کرنا دنیا کا دشوار ترین کام ہو۔ اس نے بمشکل اپنی سسکیوں پر قابو پایا تھا۔

اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ راشد کے دل میں خنجر کی طرح اتر گیا۔ وہ نفرت کی تذلیل کی توقع لے کر آیا تھا۔ پھر بھی اس کے لیے یہ سب کچھ سہنا بہت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔ وہ بے بس‘ ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر اسے خود پر شرم آنے لگی۔ ان تینوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ انہوں نے مان لیا تھا کہ وہ شکست خوردہ ہے.......... کمزور ہے۔ شاید اسی لیے اختر ملک دیوانوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ بری طرح دہاڑ رہا تھا.......... اسے دھکیل رہا تھا.......... دیوانہ وار مار رہا تھا۔ راشد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بچاؤ کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے تھے۔ اب اسے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔ البتہ وہ سن سکتا تھا.......... محسوس کر سکتا تھا۔ سعدیہ ملک بری طرح چیخ رہی تھی مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کے جسم پر تھپڑ‘ گھونسے پڑ رہے تھے۔ وہ لرز رہا تھا مگر اسے تکلیف کا مطلق احساس نہیں تھا۔

”پلیز راشد.......... راشد پلیز.......... چلے جاؤ یہاں سے.......... پلیز..........“ سمیرا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ پلٹا اور اندھادھند دروازے کی طرف بھاگا۔ باہر بارش نے اس کے اوسان کسی حد تک بحال کر دیے مگر وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ وہ جیسے تیسے گیٹ سے نکلا۔ موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے ہٹا کر اس نے کک لگائی۔ اس کی نظریں صدر دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ باؤنڈری وال چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پورچ روشن تھا۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی تھی۔ اسی لمحے صدر دروازہ کھلا اور اختر ملک نمودار ہوا۔ اس نے راشد کی طرف انگلی اٹھائی۔ اگلے ہی لمحے فضا میں فائر کی آواز گونجی۔ تب راشد کی سمجھ میں آیا کہ وہ ریوالور ہے۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے راشد نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے بڑھا دی۔ اس کے باوجود اختر ملک نے دو فائر اور کیے۔

اب وہ مری جانے والی سڑک پر تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار بہت زیادہ تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ سڑک جو ویسے ہی خطرناک ہے‘ رات کے وقت زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔

مگر اس نے موٹر سائیکل کی رفتار کم نہیں کی۔ سڑک پر کئی جگہ پے در پے خطرناک موڑ آتے تھے۔ ان پر اتنی رفتار سے موٹر سائیکل چلانا مہلک ثابت ہو سکتا تھا مگر وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھا۔

اب وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے جس پیچیدگی میں خود کو ملوث کیا تھا‘ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ صرف موت ہی اس کی الجھن کا حل تھی لیکن اس نے زندگی بھر زندگی سے محبت کی تھی۔ وہ موت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابھی چند لمحے پہلے کی صورتِ حال کا تجزیہ کیا تو حیران رہ گیا۔ اختر ملک کے فائر کرنے کے بعد وہ بھاگا تھا مگر اس کا سبب زندگی سے محبت نہیں.......... یہ احساس تھا کہ جن لوگوں کو وہ پہلے دکھ دے چکا ہے‘ اب انہیں ایک اور الجھن میں نہیں پھنسانا چاہیے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ وہیں ڈٹ گیا ہوتا۔

اس کے ساتھ ہی اسے سمیرا کا خیال آیا۔ اور سمیرا کا خیال آتے ہی موٹر سائیکل کی رفتار اس نے بلا ارادہ کم کر دی۔ سمیرا نے کہا تھا.......... کبھی کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہ لینا۔ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر وہ جھنجلا گیا۔ اب سمیرا کو کبھی اس کی پرواہ نہیں ہوگی۔ اس کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں ہوگی۔ پھر احتیاط کا کیا فائدہ۔ اس نے موٹر سائیکل کی رفتار انتہا تک پہنچا دی۔

اگلے موڑ پر سائن نظر آ رہا تھا.......... احتیاط سے‘ موڑ خطرناک ہے۔ پھر دوسری طرف سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ موٹر سائیکل اس کے قابو سے باہر ہو گئی۔ کیونکہ روشنی سے بچنے کے لئے اس نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ موڑ بہت تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ پھر موڑ پیچھے رہ گیا۔ موٹر سائیکل ریلنگ سے ٹکرائی اور اچھل کر سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں جا گری۔

زندگی کی وادی میں موت کا اندھیرا پھیل گیا۔ صرف موٹر سائیکل کا پہیہ متحرک تھا۔ ورنہ ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔

☆======☆======☆

پانچ سال کا وہ بچہ وسیع و عریض لان میں سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ لان کا چکر لگاتا اور پھر سوئمنگ پول کی طرف چلا جاتا۔ وہ سوئمنگ پول کی منڈیر پر چلاتے ہوئے پورا چکر کاٹتا۔

موڑ پر بھی سائیکل کی رفتار کم نہ ہوتی۔ سائیکل چلانا سیکھتے ہوئے وہ اس کا دوسرا ہی دن تھا۔

بوڑھی باوقار عورت بچے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ بچہ اس کے اندر ہمیشہ متضاد جذبات جگاتا تھا۔ اس سے نفرت بھی محسوس ہوتی اور ٹوٹ کرپیار بھی آتا۔ اس وقت بھی وہ ان متضاد جذبات میں گھری ہوئی اسے دیکھے جارہی تھی۔

بچہ سائیکل چلانے میں اس طرح محو تھا کہ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا مگر پھر سوئمنگ پول کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنے وجود میں نگاہوں کی چبھن کا احساس ہوا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ سفیدے کے درخت کے نیچے اس کی ماں کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ وہ شاید ابھی آئی تھی۔ بچہ گڑبڑا گیا۔ سائیکل کے ہینڈل پر اس کا کنٹرول نہیں رہا۔ توازن بھی بگڑا۔ وہ سائیکل سمیت نیچے گر گیا۔ تاہم اس کے چوٹ نہیں لگی۔

"مظفر راشد۔" ماں نے اسے پکارا۔

اس نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ "جی ممی؟"

"سائیکل وہیں چھوڑ دو اور یہاں آؤ۔" ماں کا لہجہ سخت تھا۔ بچہ سائیکل چھوڑ کر ماں کے پاس آ گیا۔ اس کی نگاہوں میں سوال تھا۔ ماں اس سے کبھی سخت لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ماں نے پوری قوت سے اس کے رخسار پر طمانچہ مارا تھا۔

بچے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "ممی! آپ نے مجھے کیوں مارا؟"

"تم اس طرح سائیکل کیوں چلا رہے تھے؟ سوئمنگ پول میں گر پڑتے تو کیا ہوتا؟"

"لیکن ممی.......... میں گرا تو نہیں۔"

"گرے نہیں مگر گر تو سکتے تھے۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ بلاوجہ خود کو خطرے میں ڈالنا بہت بری بات ہوتی ہے۔ اللہ میاں ناراض ہوتے ہیں.......... بولو.......... آئندہ ایسا کرو گے؟"

بچہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "نہیں ممی کبھی نہیں۔"

ماں نے اسے سینے سے بھینچا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ "اب

جاؤ۔ میں نے میز پر تمہارا دودھ کا گلاس رکھ دیا ہے۔ پی لو۔"

بچے کے جانے کے بعد وہ بوڑھی عورت سے مخاطب ہوئی۔ "ممی.......... آپ اسے منع نہیں کر سکتی تھیں؟"

"تو اس میں برائی کیا تھی؟" بوڑھی عورت نے بے نیازی سے کہا۔

"اگر وہ سوئمنگ پول میں گر جاتا تو.......... ؟ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا۔"

"تو کیا ہوتا۔ وہ مر جاتا۔"

"آپ کو اس کی کوئی پروا نہیں؟" لڑکی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیوں ہو' وہ میرا کیا لگتا ہے؟"

"نواسا ہے آپ کا۔"

"نہیں۔ وہ میرے بیٹے کے قاتل کا بیٹا ہے۔"

"آپ کب تک اس انداز میں سوچتی رہیں گی؟ وہ آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کا مظفر اور میرا راشد۔ میرے راشد نے جاتے جاتے اپنی غلطی کی تلافی کر دی تھی۔"

بوڑھی عورت کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کے چہرے سے اس کی باطنی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سر اٹھا کر بولی۔ "شاید.......... شاید تم ٹھیک کہتی ہو مگر مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں نہ جانے کتنا وقت لگے گا۔" پھر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔

میرا دیر تک وہیں بیٹھی رہی' یہ بات میں جانتی تھی ممی' اس نے خود کلامی کی۔ اس لیے میں نے آپ سے اور پاپا سے یہ راز چھپائے رکھا۔ اس وقت تک' جب تک سب کچھ خود عیاں نہیں ہو گیا اور اس وقت کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ دن' وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی جب اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ راشد نے اپنی محبت اور شادی کی نشانی اسے سونپ دی ہے۔ وہ وہی دن تو تھا.......... راشد کی زندگی کا آخری دن جب وہ پہلی اور آخری بار اس گھر میں آیا تھا.......... اور اگلے روز اخبار میں اس کی موت کی خبر چھپی تھی..........

☆======ختم شد======☆